LIBRARY
HYDERABAD

سیر افغانستان

تین ہم سفر

علامہ اقبال

سید سلیمان ندوی

سر راس مسعود

از

سید سلیمان ندوی

دو روپیہ چودہ آنہ عثمانیہ نفیس اکیڈمی دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار
عابد روڈ۔ حیدر آباد (دکن)

طبع اوّل ———— ایک ہزار

مئی سنہ ۱۹۴۵ء

432

پروپرائٹر

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری
باہتمام
چودھری منظور الحق
مطبوعہ
اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز
حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

از مولانا سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی

سنہ ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ شہیدؒ نے ہمارے تین بزرگوں کو کابل آنے کی دعوت
مقصود یہ تھا کہ ان بزرگوں کے گراں بہا مشوروں سے افغانستان کی ہر جہتی ترقی خصوصاً ایک مربوط نظامِ تعلیم کے سلسلہ میں استفادہ کیا جائے۔ یہ بزرگ تھے۔

(۱) حکیم الاسلام حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

(۲) حجۃ اللہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

(۳) مرحوم ڈاکٹر سر راس مسعود رحمۃ اللہ علیہ

اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء میں یہ لوگ کابل تشریف لے گئے اور صرف دو چار روز قیام پذیر رہنے
،بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس مختصر قیام میں علاوہ نادر شاہ شہیدؒ کے وزراء امراء علماء
ور ادباء سے ملاقاتیں ہوئیں مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوئے، اور افغانستان نے ان کے
نکار اور ان کی بصیرتوں سے بیش از بیش فائدہ حاصل کیا۔

اہلِ وطن نے امید کی نگاہوں سے دیکھا کہ یہ بزرگ افغانستان سے ہمارے لئے کیا
ملا لائے ہیں، یغمان کے انگور، اور قندھار کے انار سے لذتِ کام و دہن کے سوا کیا حاصل تھا
لئے انھوں نے سعدی شیرازیؒ کی طرح، اہلِ وطن کے لئے "سخنہائے شیریں" کا تحفہ پیش کیا،
اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی معروف
مثنوی "مسافر" لکھ کر پیش کی جو اس سیاحت چند روزہ پر ان کے شاعرانہ جذبات اور

حکیمانہ خیالات کا مجموعہ ہے، خیبر، سرحد، کابل، غزنین اور قندھار کے غیرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر، محمود غزنوی، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں ـــــ اور حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے یہ بیش بہا مضامین پیش کئے جو ۱۹۳۴ء کے رسالہ معارف میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں اور شاید آج پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سوانح بھی ہیں اور تذکرے بھی، احوال بھی ہیں، اور افکار بھی، تاریخی اسناد بھی ہیں اور جغرافی معلومات بھی، مدارس و معابد کا حال بھی ہے اور اخبارات و رسائل کی فہرست بھی۔ ان تحفوں سے بہتر ہمارے لئے اور کیا ہو سکتا تھا؟

دنیا میں حوادث و واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں، تاریخی یادگاریں اور اثری نشانات پائے ہی جاتے ہیں، لیکن ہر شخص کو اقبال اور سلیمان ندوی کی آنکھیں کہاں ملتی ہیں؟ گلاب ہر چمن میں اور ہر صبح کھلتا ہے لیکن ہر شخص اس "ورق معرفت کردگار" کو کہاں پڑھتا ہے۔ آفتاب ہر روز سر شام دامن مغرب میں غروب ہوتا ہے لیکن خلیل علیہ السلام کی طرح اِنّی لَا اُحِبُّ الآفِلِین کا نعرۂ توحید کون لگاتا ہے؟ ـــــ بالکل اسی طرح سفر و سیاحت سے ہر شخص یکساں استفادہ نہیں کرتا، اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچانا تو بڑی بات ہے یہ "رتبہ بلند" جسے مل گیا، مل گیا خدا کی دی

ان مضامین کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مدظلہ نے اس رواروی میں بھی افغانستان اور اس کے تاریخی آثار کو کس دقّت نظر سے دیکھا ہے اور کس خوبی کے ساتھ اسے اپنے وسیع علمی مطالعہ کے گل بوٹوں سے سجا کر پیش کیا ہے، اس کی داد دینا اپنے لئے "تو چھوٹا منہ بڑی بات" ہوگی پڑھنے والے خود اندازہ لگائیں گے۔ انداز تحریر اس قدر صاف اور بے تصنع ہے کہ بلا مبالغہ پڑھنے والا سارے سفرنامہ میں اپنے آپ کو شریک سفر سمجھتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب قبلہ انگلی پکڑے ساتھ ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔ اور بتاتے جا رہے ہیں کہ یہ دیکھو! سامنے جو شہر نظر آتا ہے غزنین ہے۔ یہیں سلطان محمود غزنوی رہتا تھا، اور اس کے بعد سنہ وار واقعات تاریخی مع تفصیل اسماء و سنین بتاتے جاتے ہیں آخر میں فرماتے ہیں کہ عباس غوری کی دسویں پشت میں علاء الدین حسین پیدا ہوا جس نے اپنے بھائی سیف الدین کے انتقام میں اس شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا اور زبان خلق سے "جہاں سوز" کا لقب پایا۔ اس کے بعد علاء الدین جہاں سوز کا لکھا ہوا فخریہ سناتے ہیں اتنے میں شہر غزنیں اور قریب آجاتا ہے، اور قدیم غزنیں کو چھوڑ کر جدید غزنیں کی آبادی سے متعلق تاریخی حقایق بیان فرماتے ہیں، احمد شاہ ابدالی کا ذکر ہوتا ہے، ان کے جانشین تیمور شاہ کا نام آتا ہے، بتاتے ہیں کہ جدید غزنیں اسی کی تعمیر ہے۔ حکیم سنائی کا مقبرہ آتا ہے، اقبالؒ مزار کے سرھانے کھڑے ہوئے رو رہے ہیں، اور زور زور سے رونے کی آواز آتی ہے،

سید صاحب قبلہ بھی متاثر آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اور مزار کا کتبہ پڑھ کر بتاتے ہیں کہ اس کتبہ سے دھوکا نہ کھانا یہ وفات کے بہت دنوں بعد کا لگایا ہوا ہے، اور شاید اس میں تاریخ غلط درج ہو گئی ہے صحیح تاریخ وفات یہ ہے۔ یہاں سے نکل کر سلطان محمود کے مزار پر جاتے ہیں، راہ میں سواروں کا ایک دستہ ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں موجودہ مسلمانان عالم کا ذکر ہو جاتا ہے۔ مزار پر کتبہ پڑھ کر بتاتے ہیں اور فرخی سیستانی مشہور مرثیہ بھی سناتے جاتے ہیں۔

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار الخ

غرض کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ ایک ماہر فن و دانائے روزگار استاد اپنے شاگرد کو ساتھ لئے ہوئے سفر کر رہا ہے، اور آثار کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے، کتابوں کے نام بھی بتاتا جاتا ہے۔

حج کے سفرنامہ ہائے سعادت کے علاوہ غالباً اردو زبان میں وہ سب سے پہلا سفرنامہ جسے علمی مطالعہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا "سفرنامۂ روم و شام" ہے۔ اور آج اس مختصر سی کتاب کو مطالعہ کرنے کے بعد آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے دوسرے کارناموں کی تکمیل کی طرح اس کی تکمیل بھی

ان کے جانشین اور ہماری قوم وزبان کے عظیم المرتبت محسن کے ہاتھوں ہورہی ہے۔ اور یہ یقین اور بھی پختہ ہو جائے گا کہ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے جن کا ایک ایک لمحہ طالبان علم اور تشنگان معارف کی خدمت میں بسر ہوتا ہے، افغانیوں کی خدمت کے لئے جب کابل گئے اس وقت بھی اُردو بولنے والوں کو فراموش نہیں کیا۔

اللّٰھمَّ مَتِّعنا بطول بقائہ وکثِّر فینا امثالہ

عبدالقدوس ہاشمی
دارالسلام۔ حیدرآباد دکن

سفرِ افغانستان

ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مدت سے آرزو تھی کہ کم از کم قریب ترین ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان ہی کو دیکھ لوں سنہ ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ العلماء پشاور کی شرکت کے زمانہ میں دو دفعہ درۂ خیبر کی سیاحت کی ایک دفعہ اس مختصر سفر کے رفیق مولوی ظفر علی خاں صاحب اور مولٰنا سید حسین احمد صاحب تھے اور دوسری دفعہ مولٰنا محمد علی اور جناب شعیب صاحب قریشی دونوں دفعہ لنڈی کوتل کے قلعہ سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا پہلی دفعہ واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ شہر پشاور کا پھاٹک بند ہو گیا، اور رات جمرود کی سرائے میں قرونِ وسطیٰ کے مسافروں کی طرح بسر ہوئی اور دوسری دفعہ لنڈی کوتل کے مشہور شنواری رئیس کے یہاں دن بھر قیام رہا۔

اس اچٹتے ہوئے جلوۂ دیدار نے آتشِ شوق کو تیز کر دیا تھا پچھلے ہی موسم گرما میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے "ناقابلِ شکست عہد" ہوا تھا کہ آیندہ سال افغانستان کی سیر کی جائے ابھی اس گرمی پر پوری سردی بھی آنے

نہ پائی تھی کہ خود "کوہِ طور" سے طلب دیدار کی صدا بلند ہوئی۔

ڈاکٹر سر اقبال کا نوازش نامہ آیا کہ حکومتِ افغانستان نے مجھے اور سر راس مسعود اور آپ کو اپنے ہاں کے بعض علمی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کی غرض سے بلانا چاہا ہے، کیا آپ چلنے کو تیار ہیں، میں نے جواب دیا کہ اس ملک کی جو خدمت مجھ سے بن آئے، میں اس کے لئے تیار ہوں، اِس کے بعد ۷؍ اکتوبر کو ہز اکسلنسی صلاح الدین سلجوقی جنرل قونسل افغانستان کا خط آیا، جس میں اسی مطلب کا اظہار تھا، میں نے ان کو بھی اپنی آمادگی کی اطلاع دی جنرل قونسل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ ہم لوگ ۱۴؍ اکتوبر کے جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اس لئے تاریخ کی تعیین کا مسئلہ پاسپورٹ کے ملنے کے بعد رفقاء کے مشورہ پر موقوف رہا۔ توقع تھی کہ ۱۹؍ اکتوبر کو پاسپورٹ مجھے مل جائے گا، اور اُدھر سر راس مسعود صاحب کو یونیورسٹی کی مشغولیتوں کے سبب سے جلد واپسی کی عجلت تھی، ۱۷؍ تک ان صاحبوں کو پاسپورٹ مِل گئے، اور ۲۰؍ کو لاہور سے اور ۲۱؍ کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بن گیا، اور وہ اسی کے مطابق روانہ ہوگئے میری نسبت دفتری تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور بالآخر ۱۸؍ کو نینی تال میں اس پر دستخط ہوئے، اور ۲۱؍ کو وہ اعظم گڈھ پہنچا، میں لکھنؤ چلا آیا تھا، دوسرے دن ایک آدمی کی معرفت پاسپورٹ لکھنؤ بھیجا گیا، جہاں وہ ۲۳؍ کی صبح کو پہنچا، اور میں اسی روز کے میل سے ۲ بجے پشاور روانہ ہوگیا، پشاور میں برادرانِ عزیز حکیم عبدالعزیز ندوی اور حکیم عبدالجلیل ندوی اور

افغان مامورِ ویزہ (افغان پاسپورٹ آفیسر) عبدالغفور خاں صاحب کو تار پہلے ہی دے دیا تھا، ۲۴ر کی رات کو ۸ بجے کے قریب گاڑی پشاور سے ایک اسٹیشن پہلے نوشہرہ پہنچی، یہاں غیر متوقع طور پر حکیم عبدالعزیز صاحب ندوی، حکیم عبدالجلیل صاحب ندوی، عبدالرحمٰن صاحب ندوی تاجر پشاور پہلے سے آکر موجود تھے، ان کی ملاقات سے بیحد خوشی ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد گاڑی پشاور پہنچی، گو کہ میری آمد کی اطلاع عام طور سے شائع نہیں ہوئی تھی، تاہم اسٹیشن پر نمایندگانِ حکومتِ افغان، متعدد احباب جمعیۃ العلمائے سرحد اور بھارت سبھا کے چند ارکان موجود تھے۔

شب بھر حکیم عبدالعزیز صاحب کے نوتعمیر کاشانہ "امان منزل" میں بسر کی، صبح کو شہر کے بعض علماء اور بعض قومی کارکنوں نے ملاقات کی عزت بخشی، پنجاب کی طرح صوبۂ سرحد میں بھی، شریعت کے مقابلہ میں رسم و رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے، جب سے صوبہ سرحد میں کونسل کا قیام ہوا ہے بعض پرجوش مسلمان کارکن اس کے لئے کوشاں ہیں، کہ رسم و رواج کو توڑ کر شرعی احکام کی پابندی کا قانون منظور کیا جائے، ان صاحبوں نے مجھ سے خواہش کی کہ افغانستان سے پشاور کو جب واپسی ہو تو اس اثنا میں یہاں مجلس شریعت کا اجلاس ہو اور میں اس میں شرکت کروں، چونکہ یہ خیال نہ تھا کہ واپسی کا راستہ بدلے گا، اس لئے میں نے قبول کرلیا۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد بھی ابھی سفر کی سرکاری دقتیں ختم نہیں ہوئی ہیں، ابھی افغان گورنمنٹ کے پاسپورٹ افسر کا ویزہ اور

صوبۂ سرحد کے چیف سکریٹری کے دستخط باقی ہیں، جن سے سرحد کے عبور کرنے کی اجازت حاصل ہو گی، یہ کام بھی ختم ہوا، ۲۵ کی دوپہر کو برادرم حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا جس میں شہر کے بعض علماء اور معززین شریک تھے، کھانے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی یہیں افغانستان مے جانے والا موٹر آگیا، یہاں سے حکیم عبد العزیز صاحب کے افغانی دواخانہ گیا اور وہاں سے دوستوں سے رخصت ہو کر پشاور سے نکلا، غالباً ۳ بجے سہ پہر کا وقت تھا جب موٹر پشاور کے حدود سے باہر روانہ ہوا میں نے سمجھا کہ اب عوائق سفر کا خاتمہ ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد درۂ خیبر کے دہانہ پر جمرود کی منزل آگئی موٹر ایک دفتر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، یہاں برطانی محکمۂ آمد و رفت نے ہر شخص سے ایک ایک روپیہ اور موٹر سے چار روپیے وصول کئے اور رسید دے دی موٹر میں میں تنہا تھا ساتھ ایک میرا ملازم اور دوسرا شوفر تھا۔

اب ہم درۂ خیبر کے اندر داخل ہو گئے دونوں طرف پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اور بیچ میں درہ کا پُر پیچ راستہ تھا، حکومت انگریزی نے اپنے حدود تک سڑک نہایت عمدہ بنوائی ہے، درہ کا سب سے تنگ مقام مجھے وہ نظر آیا جہاں **علی مسجد** نام چھوٹی سی لیکن نہایت تاریخی مسجد بنی ہے، مسجد کے پاس چائے سبزی اور پھلوں کی چند دکانیں ہیں، اس مسجد تک سنہ ۲۷ میں دو دفعہ پہلے بھی آچکا تھا، اور یہاں ایک نماز ادا کرنے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا، اس وقت پھر اس مسجد پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی پہلے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان یہی مسجد حدِ فاصل تھی، لیکن اب انگریزوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر

اپنی سرحد قائم کی ہے۔

اس درہ کے اوپر اسی کے ساتھ ساتھ خیبر ریلوے کی لائن بچھی ہے جس کی تعمیر انگریزی انجینیرنگ کی حیرت انگیز کرامت ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ ریلوے تقریباً ۱۵ میل تک اس طرح پھیلی ہے کہ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر، اور کبھی وادی کے دامن میں، اور کبھی کسی پہاڑی کے سینے کو بیچ سے چیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بہرحال ان ہیبت ناک مناظر سے گزرتے ہوئے ۴ بجے کے قریب لنڈی کوتل کی وسیع وادی میں قلعہ کے سامنے جاکر موٹر پھر رکا، میدان میں سپاہی ورزشی کھیلوں میں مصروف تھے، یہاں شوفر اور میرا ملازم قلعہ کے اندر گئے اور جمرود کی رسید اور پاسپورٹ جاکر دکھا آئے، جس کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت ملی، اور موٹر نے پھر آگے کا رخ کیا کچھ دیر کے بعد انگریزی سڑک کی صنعت کاری ختم ہوئی، اور درہ کا فطری راستہ نمودار ہوا، اور یہیں انگریزی سرحد کا آخری دفتر قائم تھا، ایک پہاڑی کے اوپر بنگلہ میں درہ خیبر ایجنسی کا دفتر تھا شوفر اور ملازم نے جاکر یہاں پھر پاسپورٹ دکھائے اور برطانی پاسپورٹ آفیسر نے EXAMINED کی مہر ثبت کی۔

یہاں سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تھے کہ افغانستان و ہندوستان کی موجودہ سرحد کا بورڈ نظر آیا جس پر انگریزی میں یہ لکھا تھا کہ "یہاں سے ہندوستان کی سرحد ہے، اور کسی کو بغیر صحیح پاسپورٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں" یہاں ریلوے لائنوں کے بیچ سے جانے والے راستے پر جس طرح ریل آتے وقت

پھاٹک یا کسی اور چیز سے راستہ بند کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ایک لمبے ستون کو آڑا کر کے راستہ روک دیا گیا تھا، یہاں دونوں طرف کے سنتری کھڑے رہتے ہیں، اور اُدھر کے جانے والے اُدھر کے اور ادھر سے آنے والے اِدھر کے سرحد دار کے سپاہیوں کی اجازت سے اس روک کو اُٹھا دیتے ہیں، اور مسافر پار ہو جاتے ہیں، چنانچہ حسب دستور سنتری نے برطانی سرحد داری کے سپاہی سے جو پچھلے بنگلے کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارہ سے دریافت کر کے روک کو دور کیا اور موٹر دفعتہً غلام ملک سے نکل کر آزاد ملک میں داخل ہو گیا۔

یہی مقام تورخم کہلاتا ہے، اور جواب افغانی وہندی سرحد ہے، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درہ کا جتنا حصہ زیادہ پُر پیچ اور مشکل ہے، جنگی اور سیاہی مصلحتوں کی بنا پر برطانی حکومت نے اپنے قبضہ کو وہاں تک بڑھا دیا ہے، اب اس کے بعد درہ نسبتہً پھیلنا شروع ہوتا ہے، راستہ بالکل فطری حالت میں ہے، البتہ کہیں کہیں پتھروں کو بیچ سے ہٹا دیا گیا ہے اور نشیب و فراز کو برابر کر دیا گیا ہے، اس سرحد سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے اوپر افغان حکومت کی پہلی چوکی تورخم نامی واقع ہے، اس کے نیچے پانی کا چشمہ سا بہتا ہے، اور ایک مختصر سے باغ یا چند درختوں کے جھنڈ کے سایہ میں خالی زمین مسجد کا کام دیتی ہے، یہاں وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی، اور افغان افسر نے پاسپورٹ دیکھ کر راہ داری کا محصول چار روپیے وصول کیا۔

اب ہم افغان علاقہ میں چل رہے تھے، درہ کا راستہ کشادہ ہوتا جا رہا تھا

پاس کی پہاڑیاں دور ہٹتی جا رہی تھیں، ۵ بجے کے قریب افغانی مشرقی سرحد داری کے پاس پہنچ گئے جس کا نام ڈکّہ ہے، یہاں وادی وسیع ہے، اور سامنے دریائے کابل کی نہایت کم چوڑی آبِ رواں کی چادر پھیلی ہوئی نظر آئی ایک طرف افغانی سرحد دار کا مغربی طرز کا بنگلہ تھا دوسری طرف کچی دیواروں کی عمارت کا ایک پھاٹک تھا جو افغانی سرحد داری کا دفتر تھا، یہاں شوفر اور ملازم نے جا کر پاسپورٹ دکھائے اور وہاں اس پر "سرحد داری درِ مشرقی ملاحظہ شد برائے رفتن کابل" کی اجازتی مہر لگائی گئی اور خبر دی گئی کہ یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے افغانی سرحد دار صاحب سے میری معرّفی کرائی جائے گی مگر وہ بیمار تھے، اندر سے باہر کے آنے کے انتظار میں تاخیر کا اندیشہ تھا اس لئے معافی مانگ کر آگے بڑھنے کی اجازت چاہی افغان سپاہی نے روک کی زنجیر ہٹائی اور موٹر آگے روانہ ہوا۔

اب قریب شام کا وقت آگیا تھا، پٹھان مسافر مرد و عورت، بچے اور بوڑھے آجا رہے تھے، اونٹ، گدھے، گائے، بیل، بھیڑیں، چراگاہوں سے واپس آ رہی تھیں، درہ خیبر کے شروع سے لے کر یہاں تک دیہاتی پٹھان خواتین سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں مستور کھلے منھ بڑی آزادی سے آجا رہی تھیں، بدن پر گھٹنوں تک سیاہ کرتے، پاؤں میں بڑے گھیر کی عموماً سیاہ شلواریں، سر سے پاؤں تک سیاہ چادریں، ہر قسم کے زیور اور ظاہری آرایش سے تمام تر پاک، ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ شاید اصل سادہ اسلامی پردہ یہی ہوگا۔

ڈکہ سے آگے نکلے تو پہلی افغانی چھاؤنی نظر آئی، خیمے کھڑے تھے،

سپاہی اپنی خاکی وردیوں میں چل پھر رہے تھے، ان خیموں سے ذرا ہٹ کر ان کے باورچی خانہ کا خیمہ نظر آیا، ان سپاہیوں کی وردی یہ تھی، خاکی پتلون خاکی کوٹ، سر پہ خاکی ٹوپی، جس کے آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوا، مصری سپاہیوں کی بھی اسی قسم کی وردی ہے، مگر اُن کے سر پہ ٹرکی ٹوپی رہتی ہے جس کے اوپر ایک خاکی غلاف چڑھا ہوتا ہے، اور اسی کپڑے کا آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوتا ہے، جس سے مقصد آنکھوں کے سامنے دھوپ کی تمازت کو روکنا ہوتا ہے۔

اب شام ہو چکی تھی، اور موٹر سنّاٹے کے عالم میں پوری تیزی سے دوڑ رہا تھا، کبھی کبھی پٹھان کاشتکاروں کا غول یا خانہ بدوش مسافروں کا کوئی مختصر قافلہ مل جاتا تھا، جس کے ساتھ مویشیوں کا گلہ، باربرداری کے جانور یہاں تک کہ کسی بیل یا گدھے کی پیٹھ پر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں، وادیوں میں کہیں کہیں کھیت بھی تھے، یکے بعد دیگرے افغانی چوکیاں بھی گزریں، جن کے مکانات خام دیواروں کے تھے،

درۂ خیبر سے لے کر ادھر خام مکانات کا رواج عام طور سے ہے، اور غالباً اس سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اس قسم کے مکانات بارش میں محفوظ رہتے ہیں، ادھر بارش تو کم ہوتی ہے، یہاں کی سیرابی اور سرسبزی زیادہ تر برف کے پگھلنے سے جو چشمے جاری ہوتے ہیں انہی سے ہے، واپسی میں ملتان میں بھی اسی قسم کے مکانات دیکھے، کابل و غزنین وغیرہ میں بھی ایسے مکانات نظر آئے، بلکہ تعجب ہوتا تھا کہ قلعے اور دھس اور شاہی عمارتیں

بھی اسی خام مٹی کی ہوتی ہیں، یہ مٹی نہایت چکنی اور لسدار ہے کھگل کے بعد یہ دیواریں بڑی مستحکم ہو جاتی ہیں، قلعوں میں کئی کئی گز کی چوڑی دیواریں ہوتی ہیں، اور ان میں ہر کونے پر مٹی ہی کی برجیاں بنی ہوتی ہیں، دیواروں میں بندوقوں کے لئے بے شمار سوراخ ہوتے ہیں۔

درہ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا اسی قسم کا الگ الگ قلعہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کو دوسرے کے حملوں سے بچاتا ہے، اس چھوٹے سے قلعہ کا سردار ملک کہلاتا ہے، جمرود سے لے کر لنڈی کوتل تک اور اس کے بعد بھی اس قسم کے ملکوں کے قلعے بعض مسمار بعض کھڑے، بکثرت نظر آتے ہیں، اسی قسم کی افغانی چوکیاں راستوں میں ملیں جن میں سے بعض اچھی خاصی بلند تھیں، اور سپاہی سیڑھیوں سے چڑھ اور اتر رہے تھے، چونکہ رات ہو گئی تھی، اس لئے خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوکی پر ہم کو روک دیا جائے، مگر ڈکہ کے سرحد دار سے کہہ کر ٹیلیفون سے نہ روکنے کی ہدایت کرا دی گئی تھی۔

اب رات کے ۸ بج چکے تھے، چاندنی چھٹکی تھی، ہر طرف پہاڑوں کی دیواریں نظر آتی تھیں کہیں کہیں پتھروں سے چشمے بہ رہے تھے، انسانوں اور انسانی آبادیوں کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا تھا گرم رفتار موٹر کی آواز کے سوا ہر طرف سناٹا تھا، اسی اثنا میں ایک پل آیا، جو گو نیا بنا تھا مگر ابھی استعمال میں نہیں آیا تھا نیچے چشمہ بہہ رہا تھا

ڈرائیور نے موٹر کو نیچے اُتار کر چشمے کے اندر سے گزر کر اوپر چڑھنا چاہا، انجن چشمے کے سرد پانی سے بجھ کر خاموش ہوگیا، اب بار بار انجن کو ہینڈل کرکے متحرک کرنے میں کچھ دیر لگی، باوجود اس خاموشی، تنہائی اور لق و دق میدان کے فضا میں امن و امان کا اطمینان چھایا تھا، اور جس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بحمد للہ ملک میں مسافروں کو ہر گونہ امن و آمان اور اطمینان حاصل ہے، اور یہ ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے۔

چند جھٹکوں کے بعد انجن گرم ہوکر پھر متحرک ہوا، اور اوپر چڑھ کر اس منزل کو طے کیا، اب جلال آباد قریب تھا، سڑک سیدھی اور صاف تھی، دو رویہ درختوں کی صفیں تھیں، جن کو ختم کرنے کے بعد ہم کو جلال آباد کے چراغ نظر آنے لگے، اور بالآخر آبادی آئی، اور ہم باغِ شہید نام سرکاری مہمان خانہ میں جاکر اُترے، سیڑھی پر مامور صاحب استقبال کے لئے کھڑے تھے، باغ کے اندر یہ ایک بڑی عمارت تھی جس میں متعدد کمرے آراستہ اور مہمانوں کے لئے تیار تھے انھیں میں سے ایک کمرہ میں اُتارا گیا، مسہری اور اس پر صاف بستر اور مکمل قرینے سے لگے تھے، کمرہ میں میز، کرسی، آرام کرسی ہر چیز تھی۔

اس اکتوبر میں جلال آباد کا موسم پشاور کے برابر سرد تھا۔

یہاں پہنچ کر پہلے ہاتھ منھ دھو کر وضو کر کے مغرب اور عشاء کی یکجا مسافرانہ نمازیں ادا کیں، تھوڑی دیر میں کھانا آیا، کھانے کے بعد کابل کا مشہور سردہ اور انگور آئے، سردہ اتنا میٹھا اور ساتھ ہی اتنا

سرد تھا کہ وہ اس ٹھنڈک میں کھایا نہ گیا، رات بھر آرام کیا، صبح اُٹھ کر نماز کے بعد باغ کی سیر کی، کس قدر پُر لطف سماں تھا، باغ کی پشت پر پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن میں دریائے کابل یا کوئی اور چشمہ آہستگی سے بہہ رہا تھا، ایک چشمہ کسی طرف سے آکر باغ کی روش کے کنارے کنارے رواں تھا، روشوں پر ہر دو طرف چنار کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے، یہ مہینے افغانستان میں موسم خزاں کے ہوتے ہیں، وہاں خزاں میں پتے خشک ہونے کے بجائے زرد ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف زرد زرد پتوں کی ایک دوسری بہار نمودار تھی۔

جلال آباد کے اس باغ کا نام میں نے باغ شہید سنا، شاید اس لئے کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید نے اس کو بنوایا ہے، باغ کی عمارت کا طرز ہندوستان سے جدا تھا، بلند کرسی تھی، جس کے بعد برآمدہ برآمدہ کے بیچ کے راستے سے ایک بڑے وسیع ہال میں داخل ہو جاتے تھے۔ اس پورے ہال کے اوپر چھت کے بجائے گنبد، دونوں طرف کمرے، اس ہال کے پیچھے بلند سائبان جس کے نیچے ایک مختصر وادی جس میں پانی کی روانی اور سامنے مذکورۂ بالا پہاڑیاں، اس باغ کی تعمیر کی نسبت گو امیر حبیب اللہ خاں کی طرف سنی، مگر بڑے ہال کے بلند دروازے کے اوپر ایک پتھر نصب تھا، جس پر کتبہ لگا تھا، میں نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر افضل خاں کے نام کے سوا کچھ اور پڑھا نہ گیا۔

میں نے سنا تھا کہ بچہ سقہ کے ہنگامہ میں جلال آباد اور اس کی

سرکاری عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اس کی ایک شہادت میں نے یہ پائی کہ باغ مذکور کے برآمدہ میں جو دروازے اور کھڑکیاں لگی تھیں ان کے شیشے نہ صرف ٹوٹے تھے بلکہ اُن کی لکڑیوں کو آگ سے جلائے جانے کی کوشش کی علامتیں موجود تھیں۔

افغانستان کی آبادیوں کے مکانات کی چھتیں خام اور منڈیر کے بغیر اور سپیدی یا گچ کے بجائے مٹی سے باہر سے لپے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی عمارتوں کے دیکھنے کی عادی نگاہوں کو وہ پُررونق نہیں معلوم ہوتی ہیں، مسجدیں بھی عموماً خام دیواروں کی اور گنبد و منار سے خالی ہوتی ہیں، اس لئے وہ دور سے ممتاز نظر نہیں آتیں، اور اسی لئے باہر کے سیاحوں کو یہ آبادیاں آباد اور دلکش نہیں معلوم ہوتیں، حالانکہ وہ مکانات اندر سے بہت عمدہ آراستہ اور خوبصورت ہوتے ہیں، موجودہ شہر جلال آباد کی بھی یہی کیفیت تھی، مسافروں کے لئے ہوٹل یا کھانے کی دکانیں ہیں، چائے کے روسی سماور ہر جگہ گرم نظر آتے ہیں، یہیں سے چند میل کے فاصلہ پر ہڈا ایک گاؤں ہے جہاں کے مشہور مجاہد عالم، ملا ہڈا کے نام سے ہندوستان کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں آج سے بیس برس پہلے بہت نامور تھے اور جو انگریزی فوجوں سے بارہا نبردآزما ہو چکے تھے، ان کا سرکاری خطاب نجم المشائخ تھا جس کی نسبت سے اُن کے مدرسہ کا نام جو اُسی ہڈا میں واقع ہے، نجم المدارس ہے، اور میں نے کابل کے ایک صاحب علم سے سنا کہ وہاں ملا صاحب کا متروکہ

بہت اچھا خاصہ کتب خانہ ہے، یہ مدرسہ پرانے طرز کا عربی مدرسہ ہے

مامور صاحب جلال آباد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جلال آباد کے آس پاس بودھ لوگوں کی بکثرت سنگی یادگاریں ہیں۔

جلال آباد پشاور سے اسّی میل ہے، اور کابل پشاور سے دو سو^{٢٠٠} میل پر واقع ہے، آج ایک سو^{١٢٠} بیس میل طے کرنے تھے، صبح کو آٹھ بجے جلال آباد سے آگے بڑھے، سڑک اچھی اور کچھ دور تک نئی بنی تھی، پل بھی مرمت ہو رہا تھا، کہیں کہیں سڑکوں کی درستی بھی ہو رہی تھی پٹھان مزدور کام پر لگے ہوئے تھے، اونٹوں اور گدھوں پر لدے ہوئے خانہ بدوش قبیلے اور کہیں کہیں ہل چلانے والے کاشتکار اپنے بیلوں کے ساتھ نظر آتے تھے، جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ زیادہ سنگلاخ ہوتا جا رہا تھا۔

جلال آباد سے تھوڑی دور چل کر سب سے پہلی بڑی آبادی نملا نامی آئی، یہاں ایک وسیع شاہی باغ ہے جس میں سرکاری مہمان خانہ بھی ہے باغ میں ہر طرف درختوں کی رونق تھی، روشوں پر چنار اور آملہ کے درخت لگے تھے، گو راستہ دوسری طرف سے تھا لیکن ہم نے باغ کے دیکھنے کی خاطر باغ کے اندر سے ہو کر راستہ اختیار کیا، اس کو ایک نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے، قصبہ میں کاشتکاروں کی آبادیاں تھیں اور دوسرے باغ اِدھر اُدھر لگے تھے۔

افغانستان میں پہلے جب موٹروں اور لاریوں کی سواریاں رائج نہ تھیں اور عموماً لوگ گھوڑوں یا اونٹوں پر سفر کرتے تھے تو عموماً ہر بارہ^{١٢} تیرہ^{١٣}

میل پر پڑاؤ ہوتا تھا، اور ہر پڑاؤ پر سرکاری عہدہ داروں اور مہمانوں کے قیام کے لئے مکانات بنے تھے جن میں تمام سر و سامان مہیا رہتے تھے اب موٹروں کی گرم رفتاری نے منزلوں کو دور تر کر دیا ہے۔ اب اسّی میل سو میل، سوا سو میل پر یہ مکانات بالکل جدید فرنیچر اور ساز و سامان کے ساتھ موجود ہیں تاہم مسافر ابھی تک انھیں پرانی منزلوں کا حساب لگاتے ہیں، اور ان کی فارسی میں ہمارا ہندوستانی لفظ "پڑاو" پوری آزادی سے مستعمل ہے، اور فاصلہ بتاتے وقت مسافت کی تعیین "یک پڑاؤ" "دو پڑاؤ" سے کی جاتی ہے، میل کے بجائے اُن کے ہاں "کروہ" کا پرانا ہندوستانی فارسی لفظ جاری ہے، جس کو ہم ہندی "کوس" کا مرادف کہہ سکتے ہیں، اور جو تقریباً پونے تین انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے۔ اب جدید سڑکوں کی تعمیر میں فرنچ اصطلاحات میٹر سنٹی میٹر اور کیلو میٹر کا رواج ہو رہا ہے۔

یہاں سڑکوں پر میلوں کے نشانات نہیں لگے ہوئے ہیں اس سے مسافروں کو مسافتوں کے جاننے میں دقتیں پیش آتی ہیں، اگر ملک کی وزارت امور نافعہ اس کی طرف توجہ کرے، تو یہ ذرا سی اصلاح مسافروں کی بڑی الجھن کو دور کر دے۔

ملا سے آگے بڑھ کر شاید ایک آدھ گھنٹہ میں ہم فتح آباد پہنچ گئے، یہ جلال آباد سے اٹھارہ میل پر ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ پشاور اور کابل کے ٹھیک بیچ میں واقع ہے، یہ بھی ایک قصبہ سا ہے، مختصر سا بازار ہے

جس میں مسافروں کے کھانے پینے کی چیزیں اور سبزیاں ملتی ہیں چائے خانے مع گرم سماوروں کے کئی موجود ہیں۔

اب جب کہ کابل اور پشاور کے درمیان مسافروں کی اور اسباب کی لاریاں اور ٹیکسی گاڑیاں بکثرت آتی جاتی ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر ان کے لئے تیل اور ان کی درستی کے مختصر سامان موجود رہیں چنانچہ صوبہ سرحد کے ایک مسلمان تاجر نے افغانی سرکار سے اس کا ٹھیکہ لیا ہے، ان کی پہلی دکان تو ڈکہ میں ملی تھی، جہاں پانی پت کے ایک مسلمان نوجوان نوکر تھے، دوسری دکان فتح آباد میں ملی، دکان کی عمارت نئی بنی تھی، عمارت کے نیچے زمین دوز کمرہ تیلوں کا گودام تھا۔

نملا کے آس پاس کھیت ہیں، جن میں افغانی کاشتکار اس وقت ہل چلا رہے تھے، یہ ہل ہندوستانی ہلوں کے مشابہ تھے، اس ملک میں کھیتوں کی سیرابی چشموں اور نہروں کے پانی سے ہوتی ہے، یہ چشمے اور نہریں فطرۃً نشیب میں، جدھر جدھر گھومتی ہیں زمین کو شاداب اور سرسبز بناتی جاتی ہیں، اور وہاں آبادیاں قائم ہو جاتی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا ہے تو یہ آبادیاں بھی اُدھر منتقل ہو جاتی ہیں، اس انتقال مکانی کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں جا بجا ملتی جاتی ہیں۔

سیرابی کا طریقہ یہ دیکھا کہ کاشتکار کفگیر کی طرح کی لکڑی کا کوئی آلہ (ڈوا) ہاتھ میں لے کر نہروں سے پانی اُلچ اُلچ کر کھیتوں میں چھیترا کر پھینکتے ہیں، افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا

طریقہ بھی یہی دیکھا، سڑکوں کے دونوں طرف چشمے بہہ رہے ہیں میونسپلٹی کے ملازم جو سڑکوں کی صفائی کے لئے مامور ہیں، وہ اسی طرح سے چشموں سے پانی اُلیچ اُلیچ کر سڑکوں کو تر کرتے ہیں، تاکہ گرد و غبار بیٹھ جائے۔

جلال آباد سے فتح آباد تک سڑک کی سنگلاخی ایسی ہے کہ موٹروں کو سخت سے سخت ہچکولے پڑتے ہیں، ہمارا موٹر گو زیادہ مستعمل نہ تھا، مگر اس کے ایک پہیئے کے نیچے کی کمانی ٹوٹ گئی، فتح آباد کی تیل والی دکان میں پہنچ کر موٹر میں جب تیل ڈالا جانے لگا تو اس ٹوٹی کمانی پر نظر پڑی بڑی مشکلوں سے وہاں لوہے کی ایک لمبی سلاخ کا ٹکڑا ملا جس کو ٹیڑھا کر کے لوہے کے تار سے باندھ کر اس کمانی کی مرمت کی گئی جس میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، اس دکان کے ملازم بھی ہندوستانی تھے انھوں نے چائے سے تواضع فرمائی، انھیں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے چھ میل پر ایک مزار ہے جس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کی قبر ہے اور لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں۔

یہاں کچھ بچے قرآنِ پاک اور پرانی گلستاں و بوستاں اور کسی فارسی نظم کے سبق پڑھتے نظر آئے، ان کے گا کر پڑھنے کی خاص لے تھی، جو مجھے تو بہت خوش آیند معلوم ہوئی۔

گیارہ بجے کے قریب موٹر کی مرمت ختم ہوئی، اور ہم آگے بڑھے راستہ اسی طرح دشوار گزار سنگلاخ اور پُرپیچ تھا، ہم کو کابل پہنچکر وزرائے حکومت سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت نے کابل اور پشاور کے درمیان

ایک اور سڑک کا کام شروع کیا ہے، جو نسبتاً اس سے کم دشوار گزار ہے اور ساتھ ہی اس راستے سے کابل اور پشاور کے درمیان پچاس میل کی مسافت کم ہو جائے گی اور امید ہے کہ اس سڑک کی تیاری کے بعد ہندوستان و افغانستان کی آمد و رفت اور تجارتی کاروبار میں بہت بڑی ترقی ہو جائے گی میرے خیال میں پشاور سے جلال آباد کو وہی نسبت ہے جو چمن اور کوئٹہ سے قندھار کو ہے مگر قندھار کے بازاروں میں جو رونق اور آبادی اور دکانوں کی کثرت نظر آتی ہے، وہ جلال آباد کو نصیب نہیں حالانکہ جلال آباد پشاور سے صرف اسی میل ہے، اور اسی بنا پر جلال آباد میں تجارتی ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے کہ افغانستان و یاغستان اور دیگر مشرقی کوہستان کے درمیان یہی ایک شہر تجارت کا مرکز بن سکتا ہے۔

فتح آباد سے چل کر ڈیڑھ بجے دن کو ہم کولال نامی قصبہ میں پہنچے آبادی گو مختصر مگر مشغول معلوم ہوئی چھوٹا سا بازار بھی ہے جس میں دن رات کی ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں، کھانے کی کئی دکانیں تھیں یہاں سے کابل تک پھر کوئی ایسا مقام نہ تھا۔ اس لئے یہاں کھانے کا انتظام کیا گیا اس دکان کو ہوٹل تو نہیں کہہ سکتے، گو یہاں اس کا یہی نام ہے ہاں باورچی کی ایک ستھری دکان کہہ سکتے ہیں، ایک طرف میرے لئے اس نے میز اور کرسی لگادی اور اوپر کھانا رکھ دیا، پشاور سے جو افغانی روٹی شروع ہوتی ہے وہی پورے افغانستان میں ملتی ہے، چپاتیوں کا رواج نہیں، دنیا کے

اکثر ملکوں کی طرح یہاں بھی گھروں میں روٹیاں بازاروں سے پک کر آتی ہیں یہ بڑی قسم کی تنوری روٹی ہوتی ہے، روٹی، مرغ، انڈے اور فیرینی کے تین کھانے اور کافی کی تین پیالیاں میرے اور شوفر اور ملازم کے لئے تھیں مگر اس ارزانی کو سن کر آپ حیرت زدہ ہوں گے کہ اُن کی مجموعی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے صرف ایک روپیہ ایک آنہ تھی۔

ملک افغانستان کے اندر اب تک شاید سوا سو میل کے قریب ہم طے کر چکے تھے مگر اب تک کسی مسجد کے منارے سے نگاہیں نہیں ٹکرائی تھیں یہاں آکر یک بیک خیال ہوا کہ کیا یہ پورا اسلامی ملک مسجدوں سے خالی ہے ؟ میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے، اس نے سامنے کے بلند چبوترے کی طرف اشارہ کیا، ظہر کا وقت تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ قصبہ کی سب سے اونچی جگہ پر مٹی کا ایک چبوترہ ہے، اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دالان ہے۔ دالان میں صرف ایک دروازہ تھا اس کو کھول کر دیکھا تو دیوار میں امام کی جگہ کے لئے محراب بنائی گئی تھی اور خطیب کے لئے بغل میں ایک دو زینہ کا چبوترہ تھا، اب سمجھ میں آیا کہ چونکہ یہاں کی ان مسجدوں میں گنبد اور منارے نہیں ہوتے، اسی لئے وہ اجنبیوں کو مسجدیں نہیں معلوم ہوتیں۔

بہر حال مسجد میں ظہر اور عصر کی یکجا نماز ادا کر کے ۲ بجے کے قریب آگے چلے، اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے، راستہ کا پیچ و خم اور نشیب و فراز بڑھتا جاتا تھا، راستہ کیا پہاڑوں کے بیچ سے اور کبھی ان کے

ادھر سے اور کبھی اُدھر سے، پہاڑوں کو بچا بچا کر وہ نکالا گیا ہے اور جو اس قدر کم چوڑا ہے کہ دو موٹریں بمشکل چل سکیں، ان کے نیچے ہر قدم پر عمیق غار، کھڈ، یا چشمہ، اگر ڈرائیور ایک سکنڈ کے لئے بھی غفلت کرے تو موٹر اور سواریوں کی ہڈیوں تک کا بھی کہیں پتہ نہ چلے، پہاڑی راستوں کا پیچ و خم اس قدر ہے کہ ہر موڑ پر یہ ڈر لگتا تھا کہ کوئی لاری یا موٹر اُدھر سے آئے تو ٹکرا نہ جائے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر واقف کار اور مشاق ڈرائیور نہ ہوں تو بسلامت پہنچنا مشکل ہے، اس پست و بلند اور ناہموار راستہ کو دیکھ کر سعدی کی درویشانہ کیفیت کا شعر یاد آتا تھا ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

الغرض ان خطرناک نشیب و فراز اور زیر و بالا اور چڑھاؤ اُتار راستوں کو طے کر کے مغرب کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے کابل میں بند باندھا گیا ہے اور پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، اس کے پاس ہی قرینہ کی ایک آبادی آئی، جس کا نام شاید خاک جبار ہے اور اس کے بعد دور تک راستہ اس طرح ہے کہ اوپر پہاڑی دیوار نیچے سڑک اور اس کے نیچے پتھروں سے اُلجھتا اور نشیب و فراز سے ہاتھا پائی کرتا ہوا چشمہ نما دریا کا پانی بہہ رہا ہے، اس وقت بھی کابل سے سرِ شام چلنے والی لاریاں سامان و اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی راستہ میں ملتی جاتی تھیں، اخیر مغرب کو شاید کابل سے ۱۵ میل پہلے، بتِ خاک پہنچے، یہ گویا

کابل کا پھاٹک ہے، پرانی وضع کا اچھا خاصہ بازار ہے، آمد و رفت کی کثرت بھی تھی یہاں سرِ راہ ایک مکان کے سامنے موٹر رکا معلوم ہوا کہ یہاں کابل جانے کا محصول چنگی وصول ہوتا ہے، یہاں سے کابل کا سیدھا راستہ ہے سڑک چوڑی ہموار اور صاف سڑک کے دونوں طرف چشمے بہہ رہے تھے اور ان کے نیچے غالباً چنار کے درخت دو رویہ لگے تھے جیسے جیسے شہر قریب آتا جاتا تھا روشنی کی رونق بڑھتی جاتی تھی، اب شہر کابل کا چنگی خانہ آیا یہاں موٹر کا نمبر ڈرائیور کا نام، مسافر کا نام وغیرہ درج کیا گیا یہیں ٹیلیفون آیا کہ حکومت کی طرف سے چند نمایندے استقبال کے لئے آرہے ہیں، چند منٹ انتظار کیا جائے، انتظار کو کچھ ہی منٹ گزرے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار شاہی موٹر آکر رکا، اور اس سے چند اصحاب اترے جن میں سے ایک وزارت خارجیہ کے اور دوسرے صاحب وزارت تعلیم کے نمایندے اور ایک دو اور بزرگوار تھے، انھوں نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی وزارتوں کی طرف سے خوش آمدید اور مہمان نوازی کے الفاظ ادا فرمائے، اور مجھے اپنی کار پر لے کر شہر میں داخل ہوئے۔

رات کا وقت تھا شہر کے اکثر حصے بجلی کی روشنی سے منور تھے بعض حصوں کی عمارتیں اچھی خاصی بلند اور شاندار، اور سڑک صاف و ہموار تھی، پولیس کے سپاہی اچھی خوش نما وردیوں میں آمد و رفت کے نظم و نسق کے لئے کھڑے تھے، پرانے کابل سے گزر کر ہم کابل کے نئے

شہر میں پہنچے، اور دار الامان میں لائے گئے جس کو امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں جدید طریق پر آباد کرنا چاہا تھا، یہاں یورپین انجنیروں کی نگرانی میں جدید طرز و انداز کی پانچ چھ سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں، اور ہر عمارت کئی کئی منزل کی ہے، انھیں عمارتوں سے ایک شاندار عمارت شاہی مہمان خانہ ہے، اسی مہمان خانہ کے سامنے آکر موٹر رکا اور ہم سب اتر کر باغ کے اندر داخل ہوئے، اس باغ کے پھاٹک پر وہ صاحب ملے جو ہم نو وارد مہمانوں کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کے لئے مقرر تھے، ان کا نام سرور خاں اور گویا تخلص ہے، یہ امیر عبدالرحمن خاں مرحوم کے زمانے کے مشہور سردار عبدالقدوس خاں کے پوتے ہیں، پچیس تیس کے درمیان عمر ہوگی یہ فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، شعر و شاعری کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں، فارسی میں کم کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، شعر العجم اور میرزا مظہر کے خریطۂ جواہر کے تمام منتخب اشعار ان کی نوکِ زبان ہیں، اندازہ ہے کہ پچیس تیس ہزار شعر اُن کو یاد ہوں گے، اخلاق پسندیدہ، اطوار شایستہ، ذہن رسا مذاق عالی، تذکروں کے حافظ، اور قلمی کتابوں کے جویا، فارسی تحریر کا سلیقہ بہت خاصہ رکھتے ہیں، کابل کی شاہی انجمن ادبی (جس کو "رائل اکاڈمی" کہنا چاہئے اور جس کو موجودہ حکومت نے قائم کیا ہے) کے رکن رکین ہیں، رسالہ کابل میں ان کے مضامین چھپا کرتے ہیں۔

سرور خاں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا میں نے عرض کی "در کابل دیدہ بودم

واکنوں در کابل؎ می بینم" انھوں نے اس فقرہ سے مزا لیا، اور مجھے ساتھ لے کر مہمان خانہ کی دوسری منزل پر لے گئے، جہاں ہمارے پیشرو رفیقوں کا قیام تھا اور اس کا ایک کمرہ میرے لئے مخصوص تھا، یہاں سب سے پہلے مدیر صاحب مہمان خانہ سے تعارف کرایا پھر ڈاکٹر اقبال اور نواب سرراس مسعود سے جا کر ملا، سرراس مسعود کے ساتھ پروفیسر ہادی اور ڈاکٹر سر اقبال کے ساتھ غلام رسول خاں بیرسٹر لاہور، سکرٹیری ہو کر آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، پروفیسر ہادی میرے پرانے دوست ہیں، ان سے بارہ برس کی ملاقات ہے، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے ہیں، پہلے سائنس کے لئے انگلستان گئے تھے پھر واپس آ کر جامعۂ ملیہ میں رہے، وہاں سائنس کلاس کو ترقی دی پھر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے، فارسی ایک حیثیت سے ان کی مادری زبان ہے، اور ایرانی فارسی، ایرانی لب و لہجہ میں اچھی بولتے ہیں اور ماشاء اللہ مردانہ حسنِ صورت اور اعتدال قامت سے بھی سرفراز ہیں، فارسی میں اب جا کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی ہے، اور ایرانی جہاز رانی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

غلام رسول خاں آج سے چوبیس برس پہلے امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں کابل میں بصیغہ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے اس لئے ان کی رفاقت سے سب کو بہت آرام پہنچا۔

بہرحال اس وقت جب ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے

؎ پہلے کابل سے رسالہ کابل اور دوسرے سے شہر کابل مراد ہے۔

عرض کی کہ مجھے چھوڑ کر آپ سب کے اس بعجلت سفر پر مجھے اردو کا ایک پرانا شعر راستہ بھر یاد آیا کیا۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

سب نے کہا یہ شعر گویا آج ہی کے لئے کہا گیا تھا

اس وقت نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے ہاں مہمانوں کی دعوت تھی ان کا ٹیلیفون آیا کہ "نو وارد مہمان" بھی شریکِ دعوت ہوں، اور لوگ تیار ہو چکے تھے اس لئے تاخیر کے خیال سے میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس، ساتھ ہو گیا، ہم لوگ دو موٹروں میں روانہ ہوئے ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سرور خاں گویا اور دوسرے میں سر راس مسعود پروفیسر ہادی اور غلام رسول خاں، تھوڑی دیر میں صدر اعظم صاحب کے محل تک پہنچے محل میں ہر جگہ بجلی کی روشنی تھی جگہ جگہ فوجی سپاہیوں کے پہرے تھے ایک دروازہ پر پہنچ کر اترے دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے، سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے محل میں ہر چیز یورپین طریق و قاعدہ سے تھی ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع دالان میں پہنچے سب سے تعارف اور ملاقات ہوئی، مہمانوں میں جن صاحبوں کے نام اس وقت یاد آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ، شہزادہ اسد اللہ خاں کمانڈر افواج شاہی، سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ، سردار احمد خاں وزیر دربار اللہ نواز خاں وزیر فوائد عامّہ

میر عطا محمد خاں صدر مجلس اعیان (پارلیمنٹ) وغیرہ

چند منٹ کے توقف کے بعد سردار ہاشم خاں صدر اعظم تشریف لائے، بالا قد، وجیہہ چہرہ، گورا رنگ، متوسط بدن، فرنچ کٹ داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، جسم پر کوٹ اور پتلون، افغانستان جدید میں امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے سر کے علاوہ باقی جسم میں یورپین لباس رواج پذیر ہے یہاں کے تعلیم یافتہ اصحاب، ارباب مناصب عہدہ دار فوج، پولیس، سپاہی، حتیٰ کہ خدام اور سرکاری شوفر تک یہی لباس پہنتے ہیں

ہاشم خاں نے آکر مہمانوں سے مصافحہ کیا، سردار فیض محمد خاں نے ہندوستانی مہمانوں کا ایک ایک کرکے تعارف کرایا، اِس کے بعد سردار ہاشم خاں سب کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے، کھانا میز و کرسی پر تھا، اور ہر چیز یورپین طریق پر آراستہ تھی، کھانا کھلانے والے ملازمین بدستور سیاہ کپڑوں میں تھے، ہاتھوں میں سپید دستانے اور سر پر افغانی ٹوپیاں، کھانے کی گول میز مختلف قسم کے انگوروں اور پھلوں اور گلدانوں سے آراستہ تھی، کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سلیقہ ہر چیز آج کل کی متمدن دنیا کی سطح کے برابر تھی، اور بقول ڈاکٹر اقبال ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں یا تمدن جدید کی نئی دلّی میں ہیں۔

میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں، سرور خاں گویا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ رسالہ کابل میں افغانستان کے

اکثر علما و فضلا و شعرا اور ارباب کمال کے حالات چھپتے ہیں مگر اس کا ذکر اب تک نہیں آیا جس نے کابل میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی، سب نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خرسان کے عامل مقاتل بن حیان جو ابو مسلم خراسانی سے بھاگ کر ادھر چلے آئے تھے اس سلسلۂ سخن سے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع ہوگئی اور اس موضوع پر سردار فیض محمد خاں نے جو عہد امانی میں وزیر تعلیم اور اب وزیر خارجیہ ہیں، اس قدر پر معلومات گفتگو فرمائی اور ہندوستان کے موربا خاندان (پاٹلی پتر) اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر اس خوبی سے کیا کہ میں ان کا بیحد معترف ہوگیا، سر راس مسعود نے اپنے جاپانی سفروں کے حالات سے اس علمی دسترخوان میں نئی لذت پیدا کی ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ و سیاست کے نکات بیان فرمائے۔

اسی میز پر رئیس اعیان میر عطا محمد خاں کے متعلق معلوم ہوا کہ سنہ ۱۹۲۶ء والی مکہ کی مشہور موتمر اسلامی میں وہ بھی سفیر افغانستان کے ساتھ شریک تھے، اور وہ کہتے تھے کہ میں نے تمھیں وہاں دیکھا تھا، مگر مجھے ملنا یاد نہیں آیا یہ نہایت متین وسنجیدہ اور خاموش بزرگ ہیں، چہرہ پر خوبصورت داڑھی ہے، سن پچپن اور ساٹھ کے قریب ہوگا۔ عربی ممالک کی سیاحت کی ہے اور عربی زبان خوبی اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں

وزیر حربیہ شاہ محمود خاں، نادر خاں شہید مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں ابھی گو جوان ہیں مگر ماشاء اللہ جوان صالح ہیں۔ ان میں

ہر دلعزیزی اور محبوبیت کی شان معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی فوجی وردی میں تھے، اور شہزادہ اسد اللہ خاں بھی فوجی وردی میں تھے۔ یہ شاہی فوجی دستہ کے کمانڈر ہیں، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے خلف الرشید امیر امان اللہ خاں کے سوتیلے بھائی، اور نادر خاں اور ہاشم خاں وغیرہ کے بھانجے ہیں ابھی گو سن کم ہے مگر سعادت کا نور پیشانی پر نمایاں ہے غالباً پچیس برس کے قریب عمر ہوگی۔

ہمارے رفقائے طعام میں اللہ نواز خاں بھی خاص ذکر کے قابل ہیں شاید لوگوں کو یاد ہو کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے ان میں سے ایک یہ تھے گو یہ اصلاً افغان ہیں مگر مدت سے ان کا خاندان ملتان میں آباد ہے، اور وہ اس طرح ہندوستانی اور افغانی دونوں ہیں، بچہ سقا کے ہنگامہ کے وقت جنرل نادر خاں کو جس نے سب سے پہلی مدد دی وہ یہی تھے، اُن کا مجاہد کی حیثیت سے سرحد کے بعض قبائل پر اثر تھا وہ انھیں میں سے تین آدمی لے کر نادر خاں کے پاس آئے اور انھیں کا سب سے پہلا دستہ تھا جو شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل پہنچا تھا موجودہ حکومت ان کے خدمات کی پوری قدر کرتی ہے اور اس نے ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر ان کو سرفراز کیا، اور اب وہ آجکل وزیر فوائد عامہ (پبلک ورکس) ہیں، دوہرا بدن، چوڑا چہرہ، گندم گوں رنگ، چہرے سے استقلال اور عزم برستا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں آکر بیٹھے، چائے کافی

سگریٹ وغیرہ سے تواضع ہوتی رہی، سردار ہاشم خاں نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ہے میں نے کہا بلا ساز کے کوئی مضائقہ نہیں وہ شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے فرمایا "ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی مرد گاتے ہیں" ڈاکٹر اقبال نے تائید کی گویوں یا قوالوں یا فوجی نغمہ نوازوں کا ایک دستہ آیا نشستیں کرسیوں پر تھیں وہ ادب سے آداب بجا لا کر نیچے قالین پر بیٹھ گیا اور نغمہ طرازی شروع کی ہندوستان میں تو بیدل عظیم آبادی کی بہت کم پرسش ہے مگر افغانستان اور سنا ہے ایشیائے وسطی کے دوسرے فارسی داں ملکوں میں بیدل کی بہت قدر ہے، قوالوں نے بھی بیدل کی غزل شروع کی پھر حافظ کی ایک دو غزلیں پڑھیں، پھر بیدل کو شروع کیا، تھوڑی دیر تک یہ مجلسِ سماع گرم رہی اور بعد ازیں میزبان کا شکریہ ادا کر کے سب مہمان ۱۱ بجے رات کے قریب رخصت ہوئے۔

دوسرے دن جمعہ کا روز تھا خیال تھا کہ آزاد اسلامی ملک کا بھی جمعہ دیکھیں، صبح کو مختلف اصحاب ملنے کو آئے جن میں ہندوستانی بھی تھے اور تعلیم یافتہ افغان اور اہل منصب بھی ہندوستان اور افغانستان کے وقت میں قریب قریب ایک گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے، وہاں کی گھڑی ہمارے ہاں سے ایک گھنٹہ پیچھے رہتی ہے میں نے اپنی گھڑی نہیں بدلی تھی اور صاحبوں نے پیچھے کر لی تھی نماز کا وقت بارہ بجے کے بعد آگیا شاہ نادر خاں مرحوم مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مگر اس دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں جس کا نام "جامع مسجد پُل خشتی" ہے نماز پڑھنے والے تھے،

ہم لوگ بھی وہیں پہنچے امیر معاویہ پر جب سے دمشق کی مسجد میں ایک خارجی نے حملہ کیا تھا اُس وقت سے سلاطینِ اسلام میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ مسجد کی عمارت میں ایک گھرا ہوا کمرہ بادشاہ کے لئے ہوتا ہے، امیر معاویہ نے جب یہ بدعت جاری کی تھی تو اس کا نام "مقصورہ" تھا معلوم نہیں افغانستان میں اس کو کیا کہتے ہیں بہرحال اس جامع مسجد میں بھی یہ مقصورہ بنا ہوا ہے، اور افغانستان کے بادشاہ اسی میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔

"پُلِ خشتی" ایک پل کا نام ہے جو لکڑی کے بجائے اینٹوں سے بنا ہے اس لئے پُلِ خشتی کہلاتا ہے اور اسی نسبت سے مسجد کو جامع مسجد پُلِ خشتی کہتے ہیں، یہ مسجد پرانے شہر میں ایک تنگ بازار کے اندر واقع ہے مسجد گو وسیع تھی مگر ہندوستان کی جامع مسجدوں کی طرح شاندار نہیں نمازی دروازے سے لے کر محراب تک بھرے تھے، غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی، ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کی عام مالی حالت بلند نہیں، یہ سب پرانے افغانی لباسوں میں تھے، سامنے منبر پر کوئی افغانی مولوی صاحب فارسی میں وعظ فرما رہے تھے۔

ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا، وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے تھوڑی دیر کے بعد اعلیٰحضرت شاہ نادر خاں مرحوم تشریف لائے، چھریرا بدن، بالا قامت، جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ پاؤں میں بوٹ، سر پہ کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے مسجد میں وہ نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے اہلِ مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے

رہے یعنی جن صفوں سے وہ گزرے وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوئے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا، موحد مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر موثر ہے کہ خانۂ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں جب وہ مقصورہ کے دروازہ کے پاس آئے تو آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اسلام کی مساوات کی عملی مثال کے طور پر دل میں محفوظ رہے گا۔

وہ مقصورہ کے دروازے کے سامنے پہنچے تو ایک بلند بالا غریب پیر کہن سال اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان تک پہنچا سر پہ عربی مندیل بندھی تھی پاس پہنچ کر اس نے شاہ مرحوم کے رخسار کو بوسہ دیا (افغانستان میں محبت کے اظہار کے طور پہ ایک دوسرے کے رخسار کو بوسہ دیتے ہیں) شاہ مرحوم نے بھی اسی محبت سے اس کے رخسار کو بوسہ دیا اور اس کو اپنے ساتھ مقصورہ میں لے آئے، اور باڈی گارڈ کے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کو بھی یہیں اگلی صف میں جگہ دو، اندر آکر سب سے ملے، مجھ سے چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی اس لئے سردار فیض محمد خاں نے مجھے ملایا، مصافحہ کیا، اور تواضع اور خاکساری کے انداز میں خیریت دریافت فرمائی، اور اپنے پہلو میں جگہ دی تھوڑی دیر کے بعد وعظ ختم ہوا، موذن نے اذاں دی اذاں کے بعد سب سنتیں پڑھنے کو کھڑے ہوگئے، پھر دوسری اذان ہوئی اور خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا دوسرے خطبہ کے آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خاں کا نام لیا، تو میں نے دیکھا کہ مرحوم نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر تواضعاً اپنے سر کو جھکا دیا

ان کی یہ ادا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔

خطبہ کے بعد دوگانہ جمعہ اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں، لوگ اپنی جگہ جگہ پر بیٹھے رہے، اس کے بعد امام نے دعا مانگی اور سب مصلیوں نے بھی آمین کے لئے ہاتھ اٹھائے، نماز سے فارغ ہو کر شاہ مرحوم نے ایک اور موثر نظارہ پیش کیا، ان مرد ضعیف کو اپنے پاس بلا کر ہم لوگوں سے فرمایا کہ "یہ سید ہیں، اور نیک ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں" پھر ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے کہ "اسلام کا بھلا ہو اور مسلمانوں کی خدمت جس سے بن آئے اس کو نیک توفیق عطا ہو"۔ پہلے تو وہ سمجھے نہیں کہ شاہ مرحوم نے کیا فرمایا، شاہ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے تو انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے شاہ مرحوم نے اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اُٹھا کر آمین کہی

اس کے بعد سب اٹھے شاہ مرحوم نے ہم مہمانوں سے فرمایا کہ "میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے، اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو ساتھ ہی کھانا تناول کریں"۔ مگر دوسرے ضروری کاموں کے سبب سے ہم سب نے اس وقت معذرت چاہی اس کے بعد سب سے مل کر وہ اپنے موٹر پر واپس گئے ان کے پیچھے اُن کے باڈی گارڈ کی کار روانہ ہوئی۔

ہم غلام ملک کے رہنے والوں کے لئے شاہ و گدا کی یکساں نماز کا نظارہ نہایت موثر تھا ڈاکٹر اقبال فرمانے لگے کہ آج میں سمجھا کہ دار الحرب

میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں؟ میں نے عرض کی ڈاکٹر صاحب آپ نے اسلام کے نظریہ کے طور پر جو فرمایا تھا۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آج آپ نے عملاً اس کی تصویر دیکھی اگر غزنین کا بڑا مرقع نہیں دیکھا تو کابل کا چھوٹا مرقع تو دیکھ لیا، فرمایا، ہاں دیکھ لیا۔

چینی ترکستان۔ نماز جمعہ سے واپسی میں میرے اور ڈاکٹر اقبال صاحب کے ساتھ ایک اور ذمہ دار باخبر بھی تھے، ان سے چینی ترکستان کے واقعات کی نسبت گفتگو ہوتی رہی چینی ترکستان اور افغانستان کی سرحدیں باہم ملتی ہیں، یہ معلوم ہوا کہ جس طرح ہندوستانی سرحد کے قبائل ہیں اسی طرح اُدھر بھی قبائل ہیں جن کے چینی ترکستان سے تعلقات ہیں ان قبائل میں سے پانچ ہزار افغانوں کے قریب ترک مجاہدین کے شریک حال ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ روسی حکومت ان مجاہدین کی حکومت کو ذرا بھی کامیابی نصیب ہو تو اس کو تسلیم کر لینے کے لئے بالکل تیار ہے بلکہ وہ اس کے لئے بخارا کے سابق گورنر کو بطور سفیر اعلیٰ کے منتخب کر چکی ہے اس کی بھی تصدیق ہوئی کہ اس ترکی تحریک میں کامیابی کی طرف سے خطرات چینی حکومت کی فوجی قوت کے سبب سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی باہم فرقہ آرائی اور نفاق انگیزی کے سبب سے ہیں چنانچہ چین کی طرف سے لڑنے کے لئے بھی جو لوگ آئے ہیں وہ تنگیاں یعنی چینی مسلمان ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی مرکزیت اور اسلام

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر ایک عجیب بات فرمائی جو حالات کے لحاظ سے یقیناً متوقع ہے۔ فرمایا کہ یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھیں جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا لیکن اب یہ نظر آرہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی، اب آیندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے۔ اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا۔ اِس لئے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا اس کے لئے ابھی سے اس کو تیاری کرنی چاہیئے۔

اس نظریہ کے ثبوت میں یقیناً حالات ہمارے سامنے ہیں پشاور سے کابل کو چمن سے قندھار کو کابل سے مزار شریف اور ہرات کو قندھار سے ہرات کو موٹریں اور لاریاں چل رہی ہیں، اُدھر راستہ یا بخارا ہو کر یا اُدھر

ایران ہو کر طے کیجئے پہلے مشرق وسطیٰ کے لوگ خشکی کی راہ سے حج کرنے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ سے ہندوستان کے بندرگاہوں سے جانے لگے، اور انگریزوں کے عہد میں افغانستان اور ترکستان بلکہ اکثر مشرقی ملکوں کے مسلمان ہندوستان ہو کر بحری راستہ سے مکہ معظمہ جانے لگے، اگر خشکی کا راستہ ذرا درست ہو جائے تو یقین کیجئے کہ ان حاجیوں کو پھر بدستور سابق خشکی کا راستہ پسند آنے لگے گا، اور پھر افغانستان یا بلوچستان ہو کر ایران، ایران سے عراق، عراق سے نجد، اور نجد سے حجاز کا راستہ کھل جائے گا یہی وہ راستہ تھا جو خلفاء اور شاہانِ اسلام کے زمانے میں مستعمل تھا آج کل ہندوستان میں بھی خشکی کے راستہ سے حج کے انتظامات کا اعلان اسی مستقبل کا دیباچہ ہے۔

کھانا. دارالامان میں واپس پہنچ کر کھانے کی میز پر گئے ابتداءً شوربا وغیرہ تو انگریزی مذاق کی چیزیں تھیں، مگر اس کے بعد وہی مشرقی، بلکہ ہندوستانی کھانے تھے، کھانوں کے لحاظ سے ہندوستان اور افغانستان میں فرق محسوس نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ وہاں مرچ نہیں کھائی جاتی پلاؤ کے اقسام بھی ہندوستان ہی کی طرح تھے، گوشت اور سالن بھی ہندوستان ہی جیسے ایک قسم کے پلاؤ کا نیا نام مستان بتایا گیا، البتہ بیچاری دال ایسی چیز ہے جو ہندوستان کے باہر نہیں پائی جاتی افغانستان میں بھی نہیں۔

کھانے پر خاکسار، ڈاکٹر اقبال، سر راس مسعود، پروفیسر ہادی، غلام رسول خاں بیرسٹر، سردار فیض محمد خاں، اللہ نواز خاں اور سرور خاں گویا تھے۔

حضرت نور المشائخ۔ ڈاکٹر صاحب نے ۵ بجے حضرت نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر کرایا تھا، میں بھی ساتھ گیا، یہ حضرت نور المشائخ وہی ہیں جو ہندوستان میں ملّائے شور بازار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا اصلی نام فضل عمر ہے، مشائخ میں سے ہیں طریقہ مجدّدی ہے، شہر کابل اور قبائل میں اور شاہی فوج میں بکثرت ان کے مرید ہیں ۱۹۱۸ء کی جنگ افغانستان و انگریز میں یہ بھی جنرل نادر خاں مرحوم کے ساتھ جہاد میں شریک تھے، اور قبائل کو اپنی تقریر اور اثر سے افغانی لشکر میں شرکت پر آمادہ کرتے تھے، افغانستان کی اس جنگ آزادی میں ان کا بھی خاص حصّہ ہے۔

ہندوستان میں بھی اُن کے مرید ہیں، کاٹھیاواڑ میں کچھ پٹھان ہیں وہ ان کے مرید ہیں، شاہ امان اللہ خاں کے اخیر عہد میں یہ ہندوستان چلے آئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ امان اللہ خاں نے اپنے اصلاحات کے اجراء کے معاملہ میں جب اعتدال کی حد سے آگے قدم رکھا تو وہ شاہ موصوف سے خفا ہو کر افغانستان سے باہر چلے گئے اور عہد کیا کہ جب تک کہ امان اللہ خاں وہاں ہیں، وہ وہاں نہیں جائیں گے چنانچہ بچۂ سقا کے پورے عہد میں وہ ہندوستان ہی میں رہے اُن کے بھائی ان کو لینے آئے بھی تو نہیں گئے نادر خاں کی کامیابی کے بعد یہ افغانستان واپس گئے حکومت نے ان کا بڑا خیر مقدم کیا اور ان کو وزیر عدالت مقرر کیا اور ان کے بھائی محمد صادق خاں مجددی کو سفیر بنا کر مصر بھیجدیا۔

حضرت نور المشائخ کا خطاب غالباً حکومت موجودہ کا عطا کردہ ہے، اور اب وہ اسی نام سے وہاں پکارے جاتے ہیں اور حضرت صاحب شور بازار بھی کہے جاتے ہیں، انھوں نے وزارت عدل کا کام کچھ دنوں تک انجام دیا، مگر پھر اپنی درویشی اور طریقہ ارشاد کے مسلک کے خلاف سمجھ کر عملاً اس سے دست کش ہوگئے، حکومت نے بھی گو عملاً ان کے استعفے کو قبول کر لیا تھا مگر رسماً اب بھی وہ وزیر عدل تھے اور ان کے ساتھ ان کے داماد مولٰنا فضل احمد مجددی معین وزارت عدل تھے اور وہی اس محکمہ کے کام کرتے تھے اس وقت تک یہی صورت حال تھی

ان کا مکان پرانے شہر کے اندر ایک گلی میں ہے، موٹر ایک گلی کی موڑ پہ جا کر کھڑا ہوگیا اور میں اور ڈاکٹر صاحب اتر کر گلی میں گئے افسوس ہے کہ گلیاں صاف نہ تھیں اور بیت الخلا بنانے کا طریقہ اچھا نہیں، بہرحال گلی کے اندر ایک مکان کے پاس جا کر ٹھہرے دروازے پر کچھ اور لوگ بھی پہلے سے منتظر تھے مکان ہر قسم کے تزک و احتشام اور ظاہری آراستگی سے خالی تھا بالکل درویشانہ تھا۔ باہر نشست گاہ بھی نہ تھی زنانہ مکان تھا جہاں پردہ کرا کر ہم لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ملی، مولٰنا فضل احمد صاحب ہم کو اندر ایک لمبے کمرہ میں لے گئے جس میں ایک طرف ایک پلنگ اور باقی زمین میں سادہ فرش بچھا تھا، پلنگ پہ ملا صاحب تشریف فرما تھے ہم لوگ فرش پہ جا کر بیٹھے ملا صاحب اپنی جسامت میں ہمارے مولٰنا شوکت علی سے کم نہیں ابھی تک سر اور

داڑھی کے بال سیاہ ہیں، پاؤں میں کوئی تکلیف تھی جس کے سبب چلنے سے اس وقت معذور ہو رہے تھے ڈاکٹر صاحب سے یہ ایک دفعہ لاہور میں مل چکے تھے، مجھ سے ملاقات نہ تھی مجھ سے پوچھا کہ وطن بہار ہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ ہندوستان کے اکثر علما و مشائخ سے واقف تھے میرے نام کی مناسبت سے مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کو دریافت کیا میں نے ان کی خدمت میں اپنی خصوصیات خاندانی کا ذکر کیا پھر میں نے کہا آپ بھوپال کے حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں فرمایا ہاں میں نے کہا میرے بھائی مرحوم مولانا حکیم سیّد ابو حبیب صاحب مجددی ان کے خلیفہ تھے پھر میں نے اپنے ایک عزیز دوست حافظ فضل الرحمٰن صاحب ندوی امام مسجد درگاہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ واقع سرہند کا سلام ان کو پہنچایا انھوں نے اس کا جواب دیا یہ سرہند حاضر ہوتے ہیں کچھ دیر تک ہندوستان کے بعض حالات اور بچہ سقا کے ہنگامہ سے نجات کے واقعات پر گفتگو رہی تھوڑی دیر کے بعد چائے پیش ہوئی اور ایک کشتی میں خشک میوے (بادام اور انجیر) تحفہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب کو پیش کئے جس کے بعد ہم لوگ ان سے رخصت ہوئے۔

ہندوستانی پارٹی۔ یہاں سے سیدھے اللہ نواز خاں کے مکان پر گئے افغانستان میں ہندوستانیوں کا اچھا خاصہ گروہ موجود ہے جس میں سے اکثر سلطنت کے مختلف عہدوں پر سرفراز ہیں ان میں سے دو صاحب

ذمہ دار صاحبِ منصب ہیں ایک شاہ جی سید عبداللہ نائب سالار یہ پشاور کے رہنے والے ہیں، ہجرت کے زمانہ میں افغانستان چلے گئے تھے، حکومت نے قدر دانی کی اور اُن کو اِس بلند عہدہ تک پہنچایا، دوسرے یہ اللہ نواز خاں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، یہ پہلے شاہی اسٹاف میں یاورِ اوّل مقرر ہوئے تھے، اور اب وزیر امورِ نافعہ ہیں، اِن دونوں کے علاوہ بقیہ عہدہ دار تعلیمی، علمی اور انتظامی دائروں میں منسلک ہیں جن میں سے ایک قابلِ ذکر نوجوان مقبول الحق صاحب غازی پوری ہیں یہ شہر غازی پور کے قریب کے ایک گاؤں (بخشو پور) کے رہنے والے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایف ایس سی کے طالب علم تھے سنہ ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کرکے مولنا محمد علی مرحوم کی جامعہ میں آرہے پھر ترک موالات کے پروپگنڈے کا کام کرتے رہے اسی اثنا، میں افغانستان میں چند معلمین کی ضرورت کا اشتہار ہندوستان میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر اُنھوں نے بھی درخواست دی جو منظور ہوئی اور اس وقت سے آج تک اس ملک کی خدمت کررہے ہیں یہ پہلے ایک معلم کی حیثیت سے آئے لیکن اپنی محنت، کوشش اور مطالعہ سے گوگرد سازی میں یہ ترقی کی کہ سرکاری دیاسلائی اور بارود سازی کے کارخانوں میں داخل ہوگئے اور اپنی انتھک کوشش سے سرکاری دیاسلائی کے کارخانہ کو سابق جرمن ماہر گوگرد سے زیادہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں اسی طرح اور بہت سے ہندوستانی حضرات قابلِ ذکر ہیں ۔

ان ہندوستانی بھائیوں نے آج اپنی قدر دانی سے اپنے ان چند نووارد بھائیوں کے اعزاز میں اللہ نواز خاں کی کوٹھی میں شام کی چائے کی دعوت دی تھی کابل کے تمام ہندوستانی بھائی جمع تھے، جنکی تعداد میرے انداز میں سو ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی جس وقت میں اور ڈاکٹر صاحب پہنچے ہیں اکثر مہمان آچکے تھے حکومت افغان کے افغان نمایندوں میں سے صرف سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ تھے، سرراس مسعود صاحب وغیرہ پہلے ہی آچکے تھے اس کوٹھی کے احاطہ میں خاصہ بڑا میدان تھا۔ جس میں اس پارٹی کا انتظام تھا بیچ میں فوارہ تھا جس کے چاروں طرف نووارد مہمانوں اور خاص خاص لوگوں کی نشستیں تھیں۔

میدان میں جا بجا قرینہ سے میزیں لگائی گئی تھیں اور ان کے چاروں طرف کرسیاں بچھادی گئی تھیں کیک اور بسکٹ اور مٹھائیاں اور چائے سامانِ دعوت میں تھیں، مولانا سیف الرحمٰن صاحب مجاہد (سابق مدرس فتح پوری دہلی) اور مولانا منصور انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی یہ دونوں بزرگ مجاہدین کے مشہور سرگروہ میں تھے، مولانا سیف الرحمٰن صاحب بڑے عالم ہیں دہلی کے مدرسۂ فتحپوری میں سالہاسال مدرس اول رہ چکے ہیں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے جنگ عظیم کے زمانہ میں مولنا عبید اللہ صاحب سندھی اور یہ اور بعض دوسرے علماء سرحد چلے گئے تھے تاکہ وہاں ہندوستانی مجاہدین کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں مدد دی جائے، اب یہ

سالہا سال سے کابل میں گوشہ نشین ہیں اور مولانا عبید[1] اللہ صاحب اب حجاز میں تشریف رکھتے ہیں۔

مولنا سیف الرحمن صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے معانقہ فرمایا اور میری آمد پر خوشی ظاہر فرمائی مولنا انصاری صاحب نے بھی پرتپاک خیر مقدم کیا، سرحد میں مولنا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ اور سید احمد صاحب بریلوی کے معتقدین کی جو جماعت مجاہدین ہے اس کا مرکز چمرقند ہے، اس جماعت مجاہدین کے صدر اسوقت مولنا بشیر صاحب ہیں وہ بھی یہاں تشریف رکھتے تھے۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ کسی نے وہاں کی اس اکتوبر کی سردی میں جو ہمارے ہاں کے دسمبر کے برابر تھی، فوّارہ کھول دیا لیکن سید راس مسعود صاحب کے کہنے سے جو اس وقت مبتلائے زکام تھے وہ بند کر دیا گیا اس موقع پر سردار فیض محمد خاں نے مہمانوں کی طرف خطاب کر کے برجستہ یہ شعر پڑھا جس کا پہلا مصرع تو کسی اور شاعر کا ہے، اور دوسرا اُن کا ہے،

گوہرِ شہوار می سازد نثارِ مقدمت
ورنہ از فوّارہ مقصودِ دگر کے دارد آب

ہم میں شاعر تو ڈاکٹر اقبال صاحب ہی تھے، ان سے دوستوں نے جواب کا اصرار کیا انھوں نے تھوڑی دیر کے بعد پہلا مصرع بدل کر

---

[1] حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی ۱۹۴۴ء میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس کا جواب لکھا، جو مجھے پورا یاد نہیں رہا۔

.... می شمارد قدر احسانِ شما
ورنہ از فوارہ مقصود دگر کے وارد آب

چائے سے فارغ ہو کر مجمع کا فوٹو لیا گیا اور تعجب ہے کہ علماء نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اس کے بعد ہندوستانیوں کی طرف سے مولوی بشیر صاحب نے مہمانوں کے خیر مقدم کی تقریر فرمائی جس میں پہلے حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا، اور وہاں کی موجودہ حکومت کی تحسین کی اور ہندوستانیوں کے ساتھ اس کی قدر دانیوں کی تعریف کی اور پھر ہندوستان کے حالات کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں مصیبت ہی کے بعد راحت آتی ہے" مہمانوں کی طرف سے جوابی تقریر کا فرض میں نے ادا کیا جس کا ایک فقرہ صرف مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کو خطاب کرکے کہا کہ "تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملہ میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اب وقت ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے حسنِ خدمات سے ان گناہوں کا کفارہ ادا کریں"۔

میرے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب نے مختصر تقریر کی اور اسی پر جلسہ ختم ہوا اور ہم لوگ اپنے قیامگاہ کو واپس آئے۔

واپسی کا پروگرام۔ میرا ارادہ تھا کہ ابھی کابل میں چند روز اور ٹھہروں اور پھر پشاور ہی کے راستے سے واپس بھی جاؤں مگر معلوم ہوا کہ سید راس مسعود صاحب جنکو

مسلم یونیورسٹی کے ضروری کاموں کے سبب سے ۴ نومبر کو علی گڈھ قطعاً پہنچ جانا ہے اور ڈاکٹر صاحب کو غزنین کی زیارت کا شوق ہے، اس لئے واپسی کا راستہ غزنین، قندھار اور چمن ہوکر مقرر کیا گیا ہے، ان قدیم شہروں کی غیر متوقع زیارت کا شوق مجھے بھی ہوا، اس لئے کابل میں مزید قیام کا خیال ترک کیا اور دوسرے رفقاء کے ساتھ میں نے بھی اسی راستے سے واپسی کا عزم کیا،

ڈاک ۔ افغانستان سے ہندوستان کو ہفتہ میں دو روز ڈاک جاتی ہے، محکمۂ ڈاک کی اپنی لاریاں ہیں جن پر ڈاک پشاور کو بھیجی جاتی ہے ۲۸ر اکتوبر کی صبح کو اُٹھ کر سب سے پہلے ہندوستان چند خط لکھے جن میں سے ایک برادرم حکیم عبد العزیز صاحب ندوی کو لکھا جس میں راستہ کے تغیر کی اطلاع دی اور لکھا کہ ناظم صاحب جمعیۃ العلمائے صوبہ سرحد کو مطلع کر دیجئے کہ ان کے مجوزہ جلسہ میں شرکت سے معذوری ہے۔

افغانستان میں ابھی تک کارڈ اور لفافوں کا رواج نہیں ہوا ہے صرف ٹکٹوں کا رواج ہے ٹکٹ مختلف قیمتوں اور رنگوں کے نہایت خوبصورت ہیں جو وہیں کابل کے سرکاری مطبع میں چھپتے ہیں ٹکٹوں پر بیچ میں افغانستان کے سرکاری علم "محراب ومنبر" کی تصویر ہوتی ہے، نیچے "پست دولت افغانستان" اور اوپر فرنچ میں "پوسٹس افغانیس" اور گوشوں میں ٹکٹوں کی قیمت درج ہوتی ہے۔

اب چونکہ واپسی کا عزم ہو چکا تھا، اِس لئے ایک دو دن میں

یہاں کے قابلِ دید مقامات کی سیر کر لینی تھی ہمارے قیام گاہ سے قریب موزۂ کابل (میوزیم) یعنی کابل کا عجائب خانہ تھا، اس لئے سب سے پہلے اُدھر ہی کا رخ کیا۔

موزۂ کابل۔ یہ عجائب خانہ دار الامان میں ہے اور امیر امان اللہ خاں کی تاسیسات میں سے ہے، بچہ سقا کے عہد میں اس عجائب خانہ کی چیزوں کو بھی صدمہ پہنچا مجھے بتایا گیا کہ یہاں جو مجسمے تھے ان کو بت سمجھ کر توڑا پھوڑا گیا کچھ چیزیں شخصی تصرف میں بھی آ گئی تھیں شاہ نادر خاں نے اپنے تسلط کے بعد دوبارہ اس عجائب خانہ کو ترتیب دیا، اور دوبارہ غارت کردہ چیزوں کو مختلف تدبیروں سے یہاں یکجا کر دیا۔

۱۱ بجے دن کو سرور خاں گویا کے ساتھ میں اس عجائب خانہ میں گیا، ماشاء اللہ پتھر کی نہایت عمدہ دو منزلہ مختصر عمارت تھی، عمارت کا طول زیادہ اور عرض کم تھا دروازہ بھی شاندار تھا، دروازہ پر ایک سنتری کھڑا پہرہ دے رہا تھا، مدیر صاحب میوزیم سے تعارف ہوا، پھر چیزوں کے دیکھنے میں مصروف ہوا، بلند دروازہ کے دونوں طرف دیواروں میں خطاطیوں کے نمونے آویزاں ہیں نیچے دیوار سے لگا کر چند سنگی کتبے رکھے ہیں جن میں سے ایک شاہ جہاں کا ہے اس پر شاہ جہاں کے کابل آنے کی یادگار تاریخ منقوش ہے، اس کتبہ کی عبارت کی نقل پروفیسر ہادی صاحب نے جو بعد کو یہاں اسی وقت تشریف لے آئے تھے، لی ہے، دوسرا سنگی کتبہ اورنگ زیب عالمگیر کی کسی مسجد کا ہے، دروازہ کے بعد چند زینوں پہ

چڑھ کر ایک مستطیل سائبان آیا جس کے دونوں طرف بہ ترتیب کمرے تھے اور ہر کمرہ کسی خاص چیز کے لئے تھا انھیں میں ایک دفتر کا کمرہ بھی تھا اس سائبان میں اسلام سے پہلے کے بتوں کے مجسمے تھے ان میں زیادہ تر بودھوں کے عہد کی یادگار تھے، بعض یونانی افغانی طرز کے نمونے تھے، یہ کل مجسمے افغانستان ہی سے کھود کر لائے گئے ہیں۔

ایک کمرہ قدیم تصاویر کا تھا جس میں یہاں کے بہت سے امراء اور سلاطین کی تصویریں تھیں ایک کمرہ میں افغانستان کے پرانے ہتھیار رکھے تھے زرہ، خود، چار آئینہ، سپر، تلواریں، تیغے، پرانی بندوقیں تھیں، چار آئینہ مرثیوں میں سنا تھا مگر دیکھا نہیں، یہ سینہ پر باندھنے کا آہنی غلاف تھا، سپاہی ان کو سینوں کے بچانے کے لئے اُن پر باندھتے تھے ان ہتھیاروں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ لوہے کے اس عظیم الشان بوجھ سے لد کر کیونکہ اُس زمانہ میں سپاہی لڑتے تھے، مجھے بتایا گیا کہ بچہ سقا کے عہد میں اس کمرہ کی دو قیمتی اور تاریخی چیزیں ضائع ہو گئیں، اور یقین کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں یورپ میں پہنچ گئی ہیں، ایک بابر کا شاہی خنجر تھا اور دوسری سلطان بایزید یلدرم کی زرہ تھی۔

مجسموں کے سلسلہ میں سب سے عجیب چیز بلکہ شاید اسی عجائب خانہ کے ساتھ مخصوص چیز کافرستان (جس کو اب امیر عبد الرحمن خاں کی فتح کے بعد نورستان کہتے ہیں) کے قدیم مذہب کے بت تھے خاص قسم کی موٹی لکڑیوں کی تقاطیع سے مختلف شکلیں بنائی گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ مہیب لڑائی

کے دیوتے کا مجسمہ تھا، لکڑی کے قوی ہیکل گھوڑے پر لکڑی کا یہ تنومند اور قدآور دیوتا سوار تھا اسی طرح دوسرے کاموں کے الگ الگ دیوتاؤں کی مناسب شکلیں تھیں یہ شکلیں لکڑی کو کھود کر یا چھیل کر نہیں بنی ہیں بلکہ لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو کاٹ کر اور ایک دوسرے سے جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔

بڑے ہال میں پتھر کا ایک بڑا پیالہ رکھا تھا جس کے چاروں طرف کسی خانقاہ اور مدرسہ کے اوقاف کی سند کو خوبصورت حروف میں کھود کر گویا وقف کے ثبوت کو دوام بخشا گیا تھا، مگر یہ نہیں سمجھا گیا کہ یہاں خدا کے سوا دوام کس کو ہے چنانچہ نہ اس جائداد کا پتہ ہے نہ اس خانقاہ کا اور نہ اس مدرسہ کا، یہاں تک کہ اس کی سنگی سند کی عبارت پڑھ لینا بھی آج آسان نہیں۔

ایک دوسرے کمرہ میں وہ پرانے سکّے تھے جو افغانستان میں برآمد ہوئے ہیں ان میں یونانی اور بودھ عہد کے کچھ سکّے تھے کچھ قدیم اسلامی عہد کے تھے جن میں سب سے پرانا سکّہ عبدالملک کا تھا اس کے بعد کے اموی اور عباسی سکّے تھے غزنین اور غور کے سلاطین کے سکّے بھی موجود تھے، پھر خود افغانستان کے سکّوں کے نمونے تھے

ایک کمرہ میں قلمی کتابیں شوکیس میں رکھی تھیں یہ وہ کتابیں تھیں جو اپنے حسن خط یا تصاویر کے لحاظ سے نمائش کے قابل تھیں ان کتابوں میں حسب ذیل نسخے ذکر کے قابل ہیں۔

(۱) صُور الکواکب عبد الرحمٰن صوفی خط قدیم تصاویر عمدہ

(۲) دعوت الکواکب و الطلسمات امام رازیؒ اس کتاب کو دیکھکر یقین آگیا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ان پر اس کتاب کے متعلق جو اعتراضات کئے ہیں صحیح ہیں اس کی پہلی فصل علم کی فضیلت میں ہے

(۳) تاریخ سلطان ابو سعید بہادر خاں نسخہ سنہ ۹۸۱ھ کا لکھا تھا۔

(۴) مثنوی مولنائے روم کا ایک نسخہ جس کے شروع میں بیرم خانخاناں کے ہاتھ سے عبارت لکھی ہوئی ہے۔

(۵) ذخیرۃ الملوک شیخ علی ہمدانیؒ المتوفی سنہ ۷۸۶ھ در اخلاق۔

(۶) معافا بن اسمٰعیل المتوفی سنہ ۶۳۰ھ کی انس المتقصعین یہ وعظ و اخلاق میں ہے۔ اس میں تین سو حدیثیں اور تین سو حکایات و ابیات ہیں نسخہ سنہ ۷۳۰ھ کا ہے۔

(۷) سلسلۃ الذہب اور سبحۃ الابرار بخط مصنّف (مولانا جامیؒ)

(۸) بہارستانِ جامی بخط خوب علی رضا الکاتب نسخہ سنہ ۹۸۳ھ کا ہے مصنّف کا سال وفات سنہ ۸۹۸ھ ہے

(۹) جامی کی ہفت اورنگ اور نظامی اور خسرو کے خمسوں کا مجموعہ جس کو سنہ ۸۹۹ھ میں ہرات کے مشہور خطاطوں نے نہایت خوبی اور لطافت کے ساتھ لکھا ہے، جا بجا تصاویر ہیں اور اوراق مطلّا ہیں۔

(۱۰) بیدلؔ کے کلیات کا نہایت عمدہ نسخہ جو فرغانہ سے حاصل ہوا ہے۔

(۱۱) دیوان حافظ کا ایک عجیب و غریب نسخہ، یہ نسخہ سنہ ۹۰۷ھ میں

سلطان حسین مرزا کے عہد میں تیار ہوا۔ سرتاپا مصور اور مطلا ہے۔

(۱۲) مواہب لدنیہ کا ایک عمدہ نسخہ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں خاص اورنگ زیب عالمگیر کے قلم کی عربی عبارت ہے۔

دو الماریوں میں کچھ غیر مرتب کتابیں بھی پڑی ہوئی تھیں مگر ان میں کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی۔

ایک اور کمرہ تبرکات خانہ کے نام سے تھا، اس میں قرآن پاک کے مختلف قلمی نسخے تھے ایک بہت بڑا نسخہ تھا، جس کا خط نہایت جلی اور کاغذ ریشمی معلوم ہوتا تھا سنا کہ یہ روس سے ملا ہے، ہرن کی کھال کے کاغذ پر قرآن پاک کے تین نسخے بخط کوفی تھے جن میں سے ایک حضرت عثمانؓ کی طرف اور دوسرا حضرت امام حسنؓ کی طرف منسوب تھا، ان میں سے ایک کبھی ہندوستان میں بھی رہ چکا تھا اس پر لکھا تھا "در عہد فرخ سیر داخل کتب خانہ نواب قطب الملک شد"

صدر اعظم کی آمد۔ ابھی عجائب خانہ کی کچھ اور چیزیں دیکھنی باقی تھیں کہ خبر آئی کہ سردار محمد ہاشم خاں صدر اعظم مہمانوں کی بازدید کے لئے تشریف لا رہے ہیں، اس لئے جلد واپس آگیا واپسی کی تھوڑی دیر کے بعد سردار موصوف تشریف لائے ہم لوگوں نے دروازہ تک ان کا استقبال کیا اور پھر اوپر دوسری منزل پر اپنی قیام گاہ میں لائے، دیر تک گفتگو جاری رہی، سید راس مسعود صاحب نے ملک کے معدنیات اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ معدنیات سے میرا مقصود جواہرات کی کانیں نہیں جن کی قدر و قیمت

اب باقی نہیں رہی ہے بلکہ اس سے مقصود مختلف دھاتیں اور خصوصاً پٹرولیم ہے جس کی کثیر مقدار ان پہاڑوں اور وادیوں کے اندر معلوم ہوتی ہے، صدر اعظم نے اس تجویز کی تائید کی لیکن فرمایا کہ دقت یہ ہے کہ یورپ کے ماہرین کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ سخت شرطوں اور گرانقدر معاوضوں کے باوجود اپنا کام دیانتداری سے نہیں کرتے ان میں سے اکثروں سے حکومت کو دھوکا اٹھانا پڑا ہے اور مثال کے طور پر چند واقعات بیان کئے (سید راس مسعود صاحب نے کہا کہ میں ایسے چند دیانت دار ماہرین کا انتخاب اپنی یونیورسٹی کے ذریعے سے کرا سکتا ہوں جن پر واقعی طور سے ہم بھروسہ کر سکتے ہیں)

سڑکوں کی تعمیر کے سلسلہ میں صدر اعظم نے کہا کہ ہماری حکومت اس کام سے غافل نہیں ہے افغانستان کے قلب میں کابل سے مزار شریف تک کا راستہ ابھی بن کر تیار ہوا ہے جس کے افتتاح اور معائنہ کے لئے میں کل مزار شریف جا رہا ہوں؛ اس سڑک کے بن جانے سے مہینوں کا راستہ اب دنوں میں طے ہوگا، دوسرا راستہ کابل سے پشاور تک زیر تعمیر ہے، یہ نیا راستہ اس پرانے راستہ سے جدھر سے آپ لوگ آئے ہیں بہتر اور مختصر ہوگا، ذکر کیا کہ ایک جاپانی ایجنٹ ابھی آیا تھا اس کو یہاں آتے ہوئے لوگوں نے بہت کچھ ڈرا دیا تھا مگر اس نے تنہا موٹر پر تمام ملک کا دورہ کیا اور واپسی پر اس نے ملک کے امن وامان کی بہت تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب نے بھی سڑکوں کی تعمیر کے کام پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ آیندہ تجارتی آمد و رفت کے سلسلہ میں سنٹرل ایشیا اور افغانستان کی مرکزیت یقینی ہے اس کے بعد ریلوے کا ذکر آیا اور بتایا گیا کہ اس ملک میں ریلوے کا جاری کرنا اس وقت تک مناسب نہ ہوگا، جب تک یہ پورے طور پر طاقتور نہ ہو جائے۔

گفتگو میں دو بج گئے ہم لوگ ساتھ کھانے کو اُٹھے کھانے کا کمرہ نیچے تھا اتر کر نیچے گئے صدر اعظم صاحب نے بھی ہم لوگوں کیساتھ کھانا کھایا کھانے پر حکومت کے مالیات پر گفتگو ہوتی رہی، اسی سلسلہ میں ریاست عالیہ حیدرآباد کے مالیات کا ذکر آیا، اور بتایا گیا کہ اس موجودہ اقتصادی تباہی میں بھی اس کے مالیات کو صدمہ نہیں پہنچا۔

کھانے کے بعد سردار ہاشم خاں تشریف لے گئے سردار موصوف ہی اس وقت افغانستان میں سب سے بڑی عملی طاقت ہیں، ملنے میں نہایت با اخلاق ہیں لیکن ماتحتوں سے کام لینے میں اور اپنے فیصلوں میں پوری طرح مضبوط ہیں اس لئے رعایا اور سرکاری ملازموں پر ان کا رعب بیٹھا ہوا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان یا فرانس کے صدر اعظموں کی طرح سلطنت کی اصل انتظامی طاقت کی کنجیاں انھیں کی سخت مٹھیوں میں ہیں

بعض خاص حالات و کاغذات۔ سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ اور اللہ نواز خاں وزیر نافعہ اکثر تشریف لاتے تھے اور افغانستان کے ہر قسم کے انتظامی و تعلیمی مباحث پر ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی بچہ سقا کے

ہنگاموں کے فرو کرنے اور نادر خاں مرحوم کی کامیابی کی پچھلی تاریخ کے مخفی اوراق اللہ نواز خاں کے سینے میں بند ہیں اور یہ وہ واقعات ہیں جو اس ہنگامہ کی تاریخوں میں درج نہیں ہوئے، ہم میں سب سے زیادہ سید راس مسعود صاحب کو ان واقعات سے دلچسپی تھی ان دونوں صاحبوں سے پوچھ پوچھ کر پروفیسر ہادی صاحب کے ذریعہ سے اس کو وقتاً فوقتاً قلم بند کراتے رہتے تھے، اور عجب نہیں کہ کسی وقت وہ ان کو شائع کرائیں۔

اس وقت ان دونوں صاحبوں نے امان اللہ خاں اور جنرل غلام نبی خاں مرحوم کے تعلقات کے متعلق بعض اہم کاغذات کے فوٹو ہم کو دکھائے جن میں سے میں نے صرف ایک خط دیکھا یہ شاہ امان اللہ خاں کے دست خاص کا لکھا ہوا اور غلام نبی خاں کے نام تھا، اس خط کو "عزیزم غلام نبی خاں" کر کے شروع کیا گیا تھا جس کا مضمون یہ تھا "میں اعلانات کی کچھ مقدار بھیجتا ہوں تم اُن کو پھیلاؤ اور اعلانات کی جس قدر مزید ضرورت ہوگی بھیج دوں گا، میں نے سفیر روس سے ملاقات کی خواہش کی ہے، اس ملاقات کے نتیجے سے بعد کو مطلع کروں گا۔"

ان کے علاوہ بعض تصاویر اور فوٹو تھے جن کو میں نے نہیں دیکھا اس وقت تین۳ بجے اعلیحضرت شاہ نادر خاں مرحوم سے میری ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لئے میں اٹھ آیا اور مزید واقعات و کاغذات کا مجھے علم نہیں ہوا، میرے دوسرے رفقا پہلے ہی سے مل چکے تھے، اس لئے

شاہ نادر خاں شہید سے ملاقات

سرور خاں گویا مجھے اپنے ساتھ قصر دلکشا لے چلے، یہ قصر ایک زمانے سے شاہانِ افغانستان کا محل اقامت ہے یہ مقام شہر کابل کا بہترین حصہ ہے بلند عمارتیں موجودہ طرز کی عالی شان دکانیں، سڑک وسیع اور صاف اسی کے قرب و جوار میں وزارت خانے اور اکثر اعلیٰ سرکاری دفاتر ہیں تھوڑی دیر کے بعد قصر دلکشا آگیا اول وسیع باغ ہے اس کے بعد گوشوں میں مختلف شاہی ضرورتوں کی عمارتیں ہیں ان کو طے کرنے کے بعد قصر دلکشا کی اصلی عمارت آئی اس کے صدر دروازہ پر سنتریوں کے پہرے لگے ہوئے تھے، موٹر سے اُترتے ہی ایک سائبان میں آدمی داخل ہو جاتا ہے۔ یہ سائبان نہایت وسیع اور اس کی چھت نہت بلند ہے دروازہ کے اوپر بلندی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کتبہ خوش خط بہت جلی، سیاہ حرفوں میں لکھا ہوا ہے جس پر اندر داخل ہونے والے کی نظر تو نہیں پڑتی کیونکہ اس وقت اُدھر اُس کی پشت ہوتی ہے، لیکن اُدھر سے واپس لوٹتے وقت فوراً اس پر نظر پہنچ جاتی ہے، اس مقام پر اس کلمہ کو پڑھ کر روح کو بالیدگی ہوتی ہے میری نظر بھی واپسی ہی کے وقت اُس پر پڑی،

سائبان سے گذر کر ایک وسیع زینہ ملا، زینہ ختم ہونے پر سہ طرفہ سائبان اور ان سائبانوں کے بعد مختلف کمرے دکھائی دئیے، جو اکثر

بند تھے، پوری عمارت وسیع بلند، شاندار اور روشن ہے، تکلفات اور زیب وزینت کی ظاہری فخامت سے بری ہے بایں ہمہ سادگی مجھے اس میں بڑی جلالت نظر آئی اور احمد شاہ درانی سے لے کر، امیر عبدالرحمن خاں تک کی تاریخ سامنے آگئی حالانکہ یہ محل قدیم نہیں ہے اور بہت بعد کی تعمیر ہے تاہم آج ان کے تخت کا جلوہ یہیں نظر آتا ہے

بہرحال زینہ کے خاتمہ پر سرِ تشریفاتی موجود تھے، انھوں نے خیر مقدم کیا، اور اس کے بعد سائبان کے اوپر ہو کر ایک کمرہ میں لے گئے، وہاں ایک گول میز کے گرد چند کرسیاں بچھی تھیں جن میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا اسی کمرہ سے متصل ایک دوسرا کمرہ نظر آرہا تھا جس کا دروازہ بند تھا چند منٹ کے بعد وہ دروازہ کھلا اور مجھے اس کے اندر جانے کو کہا گیا میں نے اس دروازہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ اس کمرہ کی کھڑکیاں کسی کشادہ منظر کی طرف کھلتی ہیں اور شاہِ مغفور ادھر متوجہ ہیں مگر میرے داخلہ کے ساتھ ہی وہ میری طرف پھر گئے وہی چھریرا جسم، بدن پر سوٹ سر پر افغانی ٹوپی، اور لبوں پر ہلکا تبسم، دیکھنے کے ساتھ السّلام علیکم فرمایا اور خوش اخلاقی سے جھک کر مصافحہ کیا یہاں مستطیل میز کے طول میں خود کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا؛

سب سے اول سفر میں میری تاخیر کے اسباب دریافت فرمائے میں نے عرض کی کہ اولاً میری زندگی کی تاریخ اس قدر صاف نہیں کہ مجھے حدود ہند سے جلد نکلنے میں آسانی ہو دوم میری ایک چھوٹے سے مقام

(اعظم گڈھ) میں اقامت اور صوبہ کے مرکزی شہروں سے دوری بھی پاسپورٹ کی تاخیر کا باعث ہے، باتیں کرنے میں یہ بالکل محسوس نہیں ہو کہ اس وقت میں اس سے باتیں کر رہا ہوں، جو ایک کرور نفوس پر حکمراں ہے بلکہ پوری طرح مساوات اور حسنِ خلق کا تصور سامنے تھا کمرہ میں میرے اور شاہ مغفور کے سوا کوئی دوسرا متنفس نہ تھا اس لئے طرفین کو اظہار مطالب میں کوئی باک نہ تھا ملاقات کوئی آدھ گھنٹہ تک رہی، اور اس عرصہ میں صرف تین موضوعوں پر گفتگو رہی۔

سب سے پہلے ایک سلسلہ تقریر میں میں نے کہا کہ میں جس وقت پشاور سے روانہ ہو رہا تھا تو یہ سن کر کہ میں شاہ معظم کی دعوت پر کابل جا رہا ہوں میرے ارد گرد کچھ لوگ کھڑے ہو گئے جن میں ایک آفریدی پٹھان بھی تھا اس نے پشتو میں مجھ سے کچھ کہا جس کو میں سمجھ نہیں سکا میرے دوستوں نے اس کا ترجمہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مختصر مخلصانہ پیغام ہے جس کو وہ میرے ذریعہ آپ تک پہنچانا چاہتا تھا اور اس کا تعلق سرحدات کے افغانی طرز سیاست سے تھا پھر اس بارہ میں میرا جو اسلامی فرض تھا خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کو بطریق احسن انجام دیا اور اعلیحضرت نے اس کو پوری توجہ سے سنا، اور اس کے متعلق اپنے خیالات بہت مختصر لیکن نہایت مشرح طریق سے ظاہر فرمائے میں نے اپنی گفتگو میں سرحد کے آزاد علاقوں کو افغانستان کی چہار دیواری قرا دیا تھا فرمایا کہ "جس کو اس چہار دیواری کے اندر ہی رہنا ہے وہ کیونکر یہ گوا

ر سکتا ہے کہ اس چہار دیواری کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے کھسکے۔"

. . . .

گفتگو کا دوسرا اہم اور طویل موضوع مسئلہ تعلیم تھا، میں نے اس کے متعلق اپنے مفصل خیالات عرض کئے اور بتایا کہ افغانستان کے لئے کس قسم کی تعلیم موزوں ہے اور خصوصیت کے ساتھ میں نے یہاں کی عربی و مذہبی تعلیم کے اصول و اسلوب و طریق پر بحث کی اور دکھایا کہ موجودہ عربی تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے، نیز یہ کہ جب تک اس قسم کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب جاری نہ ہوگا علما میں موجودہ نصاب کے اندر سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان اور نوجوان افغانوں میں مذہبی شیفتگی و پابندی کا احساس پیدا نہیں ہوسکتا، اعلیحضرت مرحوم دیر تک میرے خیالات کو توجہ سے سنتے رہے اور ان کی تحسین فرمائی اور ان کی ضرورت ظاہر کی اور دریافت فرمایا کہ کیا اس طرز پر ہندوستان میں کوئی مذہبی درسگاہ قائم ہوئی ہے، میں نے دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ کا نام لیا، اور اس کے کچھ حالات بیان کئے اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس بیان سے خوش اور مسرور ہوئے ہیں۔

اس تعلق سے انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے عام حالات اور خصوصاً سیاسی حالات دریافت کئے میں نے اس وقت مسلمانوں میں جو سیاسی افتراقات اور اختلافات ہیں ان کو افسوس کے ساتھ بیان کیا پھر انھوں نے ہندو مسلم تعلقات کی نسبت دریافت کیا اس کی جو

صورت حال مجھے معلوم تھی وہ عرض کی اعلیٰحضرت مرحوم خود بھی ہندوستان کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے یہاں کے اخبارات اور خاص خاص رسالے شاہی دارالتحریر میں آتے ہیں اور ان کی نظر سے گذرتے ہیں، چنانچہ میں نے کسی بات میں معارف کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ میں اس کو ہمیشہ پڑھتا ہوں،

آخر میں ارشاد فرمایا کہ آپ ہندوستان میں جا کر میرے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق اور اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کے بجائے ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کروں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں پھر فرمایا کہ میں دین و ملت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں، پھر فرمایا کہ میرے بھائیوں سے کہہ دیجئے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعدادی اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے لئے پہلے سے تیار کرلیں،

اعلیٰحضرت مرحوم نے چونکہ ڈیرہ دون میں تربیت پائی تھی، اس لئے اردو بہت اچھی بولتے تھے، ہم دونوں نے گفتگو کا آغاز گو فارسی میں کیا لیکن

پھر بہت جلد اردو میں شروع ہو گئی جو آخر تک قائم رہی۔

چلتے وقت پھر کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور کلمات رخصت ادا کئے جن کا میں نے مناسب جواب دیا، مرحوم نہایت شیریں اخلاق منکسر مزاج پُر محبت اور رقیق القلب تھے ان کی آنکھیں مولنا محمد علی مرحوم کی طرح اشکباری کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے یہاں دعوت چائے

آج چار بجے شام کو سردار شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے ہاں چائے کی دعوت تھی، قصر دلکشا سے سیدھے سردار موصوف کے یہاں روانگی ہوئی سرور خاں گویا ساتھ تھے سردار موصوف کا دولت خانہ اس سے قریب تھا قصر دلکشا سے نکل کر وزارت خانہ والی سڑک کو عبور کرکے سردار موصوف کا دولت خانہ آگیا، افغانستان کے مکانوں کی یہ عجیب طرز تعمیر ہے کہ باہر سے صرف ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آتا ہے، اندر قدم رکھنے کے بعد اس کی پوری عظمت معلوم ہوتی ہے، موٹر سے اتر کر اندر قدم رکھا پہلے کھیل کا ایک میدان ملا جس کو "لان" کہہ سکتے ہیں پھر ایک دروازے سے ایک زینہ تک پہنچے زینہ کو طے کرنے کے بعد پہلے ایک چھوٹا کمرہ (کلوک روم) ملا جس میں باہر سے آنے والے اپنے اور کوٹ اور لبادے اُتار دیں، پھر اندر ایک بڑا ہال تھا جس میں مختلف میزوں کے گرد بیٹھنے والوں کے لئے کرسیاں بچھی تھیں پورا ہال آراستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہم اس وقت یورپ کے گوشہ میں بیٹھے ہیں ایک طرف ایک میز پر ایک تازہ ایجاد جرمن کھیل کا

تختہ نرد رکھا تھا، دوسرے گوشہ میں لاسلکی آوازوں کا صندوق تھا، تیسری طرف دوسرے کمرہ میں جانمازیں بھی رکھی تھیں اوپر پہنچنے کے ساتھ وزیر ممدوح نے اپنی فوجی خاکی وردی میں پیشوائی کی، میں نے اب تک عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی وزیر صاحب اپنی مہربانی سے مجھے خود اپنے ساتھ لے کر اپنے غسلخانہ تک گئے وہاں ہر چیز مہیا تھی پانی کے پائپ اور ہاتھ منھ دھونے کے ظروف مختلف اغراض کے تولئے اور دیگر ضروری سامان وہاں سے نکل کر ان کے ڈریسنگ روم میں داخل ہوا اور وہاں سے پھر دوسرے پرائیوٹ کمرہ میں آکر نماز ادا کی غرض یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وزیر ممدوح کے سجے کمروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا وہ بھی نہایت سلیقہ سے آراستہ تھے تصاویر اور وہ بھی برہنہ تصاویر کی جو لعنت یورپ کے بدولت ہمارے امرا کے دولت سراؤں میں داخل ہوگئی ہے وہ اس سے سراپا پاک تھے

اب تمام مہمان آچکے تھے، وزیر موصوف سب کو لے کر دوسرے کمرہ میں گئے وہاں ایک لمبی میز میووں اور پھلوں سے لدی کھڑی تھی مختلف رنگوں اور قسموں کے انگوروں کی بہار تھی، یورپین ذوق کی مٹھائیاں اور کیک اور بسکٹ وغیرہ تھے جن کی نسبت میرا خیال ہے کہ وہ کابل ہی کے بنے ہوئے تھے، پھر شایستہ لباس میں شایستہ اخلاق خادم چائے کی کشتیاں لے کر آئے اور چائے پی گئی، مہمانوں میں سردار ہاشم خاں صدر اعظم اور دوسرے وزرا اور اعیان بھی موجود تھے ۔

چائے سے فراغت کے بعد گفتگوؤں کا سلسلہ شروع ہوا میری میز
ر سردار ہاشم خاں، میر عطا محمد رئیس اعیان اور مولٰنا فضل احمد صاحب
ائب عدلیہ (اور اب وہ وزیر عدلیہ ہو گئے ہیں) تھے اس مناسب
جتماع کے موقع پر میں نے کابل میں مذہبی عربی تعلیم کے اصلاحات کی
اسکیم کو پوری تفصیل کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا اور بالآخر میں نے
رض کیا کہ افغانستان ایک ایسی درسگاہ کے بغیر اصلاحات کے مسئلہ
یں تا قیامت کامیاب نہیں ہو سکتا، صدر اعظم نے بیحد توجہ سے ان
خیالات کو سنا اور بالآخر فرمایا کہ کیا آپ ہم کو اس میں مدد دے سکتے ہیں
یں عرض کی اپنی پوری طاقت اور استطاعت کو اس راہ میں صرف
ر سکتا ہوں، بقیہ دو حضرات نے بھی پوری تائید کی اب مغرب کا وقت
قریب تھا کچھ لوگ رخصت ہو گئے کچھ لوگ دوسرے کمرہ میں نماز مغرب
کے لئے چلے گئے اور یہ بھی کہہ دوں کہ کچھ لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے بھی رہ گئے۔

نماز کے بعد شاہ محمود خاں نے لاسلکی کا صندوق کھولا تو ماسکو کے
سی روسی گانے کی آواز آئی، پھر ایران کا کوئی نغمہ سنائی دیا آواز صاف
تھی اس لئے اس تماشے کو بند کر دیا گیا چلتے وقت سردار احمد شاہ نے
و وزیر دربار تھے اور رشتہ میں شاہ مرحوم کے چچا زاد بھائی اور سمدھی
یعنی شاہ حال شاہ ظاہر خاں کے خسر) تھے کل شام کو پغمان آنے کی دعوت
ی جس کو ہم سب نے قبول کیا۔

انجمن ادبی کی اعزازی دعوت شب

ہز اکسلنسی سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے یہاں سلسلۂ گفتگو اتنا دراز ہوا کہ شام کے سات بج گئے اور ساڑھے سات بجے کابل کی انجمن ادبی نے جس کو یہاں کی رائل اکاڈیمی کہئے نووارد ہندی مہمانوں کے اعزاز میں دعوت شب (ڈنر) کا انتظام کیا تھا چنانچہ ہم لوگ یہاں سے سیدھے کابل ہوٹل کو روانہ ہوئے جہاں اس ڈنر کا اہتمام تھا کابل ہوٹل کی عمارت اچھی خاصی پختہ اور بلند ہے اور اس میں متعدد وسیع کمرے اور ہال ہیں ہم لوگ پہلے ایک بغلی کمرہ میں بٹھائے گئے اس کمرہ میں ہر طرف مہمانوں کے لئے کرسیاں بچھی تھیں اکثر مہمان جو زیادہ تر اسی انجمن ادبی کے ارکان تھے پہلے ہی سے آچکے تھے کچھ لوگ بعد کو آئے۔

یہ انجمن ادبی موجودہ حکومت کی تاسیسات میں سے ہے ملک کے اکثر اہل علم و اصحاب قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان اس کے ارکان ہیں شہزادہ احمد علی خاں درانی جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ ہیں اور دارالتحریر شاہی (سکریٹریٹ) کے ایک معزز منصب دار ہیں اس کے سکریٹری ہیں اس انجمن کی رکنیت ایک شاہی اعزاز ہے ہر رکن کو سلطنت کی طرف سے علمی وظیفہ ملتا ہے تاکہ وہ علم و فن اور شعر و سخن کی خدمت آزادی اور خوش دلی کے ساتھ انجام دے سکے یہاں تک کہ سرکاری ملازمین بھی جب اس انجمن کی رکنیت سے سرفراز ہوتے ہیں تو ان کی تنخواہ کے علاوہ وظیفہ بھی

رقم الگ ملتی ہے، ارکان میں بوڑھے بھی ہیں جوان بھی قدیم عالم بھی اور جدید تعلیم یافتہ بھی محلوق اللحیہ بھی اور صاحب ریش دراز بھی شاعر بھی اور نثر نویس بھی، عربی داں مضمون نگار بھی اور انگریزی فرنچ اور جرمن زبانوں کے مترجم بھی اس انجمن کا ماہانہ رسالہ کابل ہر مہینہ بہت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔

سب مہمانوں کے آنے کے بعد انجمن کے صدر نشین نے کھڑے ہو کر فارسی میں خیر مقدم کا ایڈریس پڑھ کر سنایا۔

خطابۂ خیر مقدم[1] جناب رئیس انجمن ادبی کابل

فضلائے محترم! اجازت دیجئے کہ افغانستان کے ادبا اور اہل قلم کی یہ ادبی مجلس اپنے خلوص و محبت کے جذبات کو جناب کے سامنے پیش اور آپ کی تشریف آوری پر اظہار شکر کرتے ہوئے خوش آمدید اور صفا آوردید کہے۔

ہندوستان کا وسیع ملک جو ہمیشہ سے نامور فاضلوں اور بڑے بڑے ادیبوں کا گہوارہ رہا ہے اور جس نے اپنے آغوش میں بڑے بڑے مشہور لوگوں اور معروف سخنوروں مثلاً سراپا دل بیدل صائب اصفہانی کلیم سلیم طالب آملی فیضی فیاضی اور آخر میں شبلی نعمانی اور آج صاحبان فکر بلند مثلاً مشہور اجتماعی فلسفی شاعر اقبال اور فرزندان جلیل القدر مثلاً سر راس مسعود علامہ سید سلیمان ندوی اور مشہور پروفیسر ہادی حسن کو پیدا کیا ہے یقیناً وہ خاک پاک ایشیا میں علم و فضل کا گہوارہ ہے اور ہم اس کو بڑے

---

[1] یہ تقریریں دسمبر ۱۹۳۳ء کے رسالہ کابل میں بزبان فارسی شائع ہوئے ہیں ہم ان کا ترجمہ رسالہ مذکورہ سے لیکر یہاں درج کرتے ہیں

احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں ہندوستان کے افق کے روشن ستاروں نے ہمیشہ فضائے عالم پر پرتو افگنی کی ہے اور ایشیا و اہل مشرق کی عزت اور سربلندی کے لئے بہت بڑی اور قیمتی خدمتیں اور کوششیں کر دکھائی ہیں۔

پس اگر ہم اس مشہور ملک کے آپ جیسے بزرگ و فرزانہ فضلاء کو اپنے ملک میں دیکھتے ہیں تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم خوش اور مسرور ہو کر ایشیا کی بلند صلاحیت اور استعداد پر فخر کریں گے۔

ایشیا عظمت گذشتہ ایشیا متمدن قدیم جو کسی زمانہ میں دنیا کے علم و تربیت کا گہوارہ اور فضل و ادب کا سرچشمہ تھا اور جس کے قیمتی ذخیرے آج تک دنیائے موجودہ کی بہت سی ترقی یافتہ قوموں کو دولتمند بنائے ہوئے ہیں ممکن تھا کہ وہ ایشیا موجودہ پستی و پسماندگی کی وجہ سے دلوں سے فراموش ہو جاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ایشیا میں جو قوم اس سرزمین کے نام تاریخ اور مفاخر کو زندہ اور روشن کرنے میں بے انتہا جد و جہد سے خدمت کر رہی ہے وہ ہندوستان ہی کے بچے اور نام آور فرزند ہیں۔

علی گڈھ کا عظیم الشان دار العلوم (یونیورسٹی) جو فرزندان ایشیا کا بہترین علمی مرکز شمار ہوتا ہے وہ کشور ہند کے ایک فرزند نجیب سر سید اعظم کی ہمت جوانمردی اور مشرق دوستی کی ایک یادگار ہے! حضرت اقبال کے قیمتی آثار و تالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق، سعی، عمل اور اجتماع جذبات شرق دوستی اور احساسات اسلام پرستی کی اہل ایشیا کے جسموں میں

روح پھونکی ہے، یہ سب ملک ہند کے فرزندوں کی ہمت اور مجاہدات کے نمونے ہیں۔

جس زمانہ میں افغانستان کے علم دوست اور ادب پرور بادشاہ یعنی غزنوی اور غوری اس کہسار سے رخت سفر باندھ کر علوم و ادبیات کو ہمارے ملک میں یتیم چھوڑ گئے تو اس وقت صرف ہندوستان ہی کی مستعد قوم تھی جس نے ہماری سرزمین کے شعرا و فضلا کے قیمتی آثار اور گراں بہا جواہرات کو آج تک کے لئے محفوظ کر دیا آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقلیم ایشیا میں بلخ و غزنی کے شعرا و فضلا کے قدر دان، مشاہیر افغانستان کے قیمت شناس اور اکابر ایشیا و اسلام کے نام و آثار کو تازہ کرنے والے زیادہ تر ہندوستان ہی کے بزرگ اور حق شناس افراد ہیں۔

آج جبکہ جناب باری کی بے انتہا رحمت کے فیض سے ہمارا افغانستان سخت خونیں اور ہولناک بھنور سے نجات پا کر ایک علم دوست اور ادب پرور فرزند یعنی اعلیحضرت محمد نادر شاہ غازی مجدد شرف و تاریخ افغانستان قدیم کے لائق ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے اور اس شہریار بزرگ کی کوششوں کے سایہ میں اپنے علم و ادب اور تاریخ کی تجدید کرنا چاہتا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر ہمدردی اور پذیرائی فضلائے ہند کی طرف سے ہو رہی ہے یعنی ہندوستان کی شریف قوم کا شریف احساس و ادراک اسلام و ایشیا کے متعلق تمام مفید مقاصد کا زیادہ اہمیت کے ساتھ اندازہ لگا رہا ہے۔

ہندوستان، ایران اور افغانستان جو ادبیاتِ فارسی کا وطن اور شعرائے عظام و عالی خیال کے ملک ہیں آپس میں ایک دوسرے کے اکابر اور شعراء کو بہت محبوب نظروں سے دیکھتے ہیں، اور اس پر دنیا کے سامنے توأم فخر کرتے ہیں۔

آخر میں ہم کہتے ہیں۔ اے محترم فاضلو! نہ تنہا ملک ہندوستان بلکہ سارا ایشیا آپ کا معنوی وطن ہے اور آپ کی بلند تمنائیں اور ارادے (جو آپ رکھتے ہیں) اور آپ کے مقصود کا ہدف خاکِ مشرق ہے! تمام اہل ایشیا خاص کر ہمارا افغانستان آپ کی بڑی امیدوں یعنی مشرق کی عظمت کی راہ میں خدا سے توفیق کی آرزو کرتا ہے ضمناً ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ افغانستان کا کوہستان یورپ کے تکلفات سے خالی ہے اور اس سرزمین نے ابتک مادی پر تکلف مسرت کا کوئی موقع نہیں پایا ہے اس لئے ممکن ہے کہ بیرونی ممالک کے خوش گذر یہاں کے سفر اور سیاحت کو پسند نہ کریں، لیکن ہم کو یقین ہے کہ اربابِ علم خوب جانتے ہیں کہ یہ سرزمین سلطان محمود غزنوی کا وطن ہے، غوریوں اور ابدالیوں کا مرز بوم ہے، ابن سینائے بلخی سنائی غزنوی، عنصری، عسجدی، دقیقی، فاریابی اور آخر میں سید جمال الدین افغانی کا مسقط الراس ہے یقیناً سب جانتے ہیں کہ کشور افغانستان اس قوم کا جائے پناہ ہے جس کے افراد عموماً اسلامیت اور ایشیائیت کے مخلص دوست تھے اور ایک شریف بادشاہ اعلیحضرت محمد نادر شاہ غازی کا پایۂ تخت ہے جو دنیائے اسلام و ایشیا کی عزت و بلندی کے تنہا ہوا خواہ ہیں آخر میں

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ جلسہ جو آپ کے اعزاز میں منعقد ہوا ہے ایک نمونہ ہے افغانستان کی قوم اور حکومت کے ادباؤ فضلاء کے اظہارِ جذبات و احساسات کا اور ہم کو آرزو ہے کہ آپ حضرات اپنے پیارے وطن میں اس ہدیہ کے نمائندے بنیں گے جس سے مراد ہماری خالص محبت و اخلاص ہے اور ہمارے معزز ہندوستانی بھائیوں کو عام طور پر ہمارا اسلام اور دوستانہ احترام پہنچائیں گے اور ہمارے ان دلی اور معنوی تعلقات کا ان سے تذکرہ کریں گے جو سالہا سال سے ہمارے دل کے اندر ہندوستان کی محترم قوم کی نسبت موجود ہیں۔

خاتمہ میں اس زحمت کو قبول کر کے جو آپ حضرات نے ہم کو عزت بخشی اور ہماری انجمن کی دعوت کو قبول فرمایا اس کے ہم بہت ممنون اور متشکر ہوئے آپ حضرات اور ہندوستان کی بزرگ قوم کی سعادت اور توفیق یابی کے خدا سے آرزو مند ہیں، آخر میں ہم کہتے ہیں مشرق باد عالم شرق! مسعود باد عالمِ اسلام!

اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ خان صاحب کی حسب ذیل نظم "خیر مقدم" کے عنوان سے پڑھ کر سنائی گئی۔

عزیزاں ز ہندوستاں آمدند در افغانستان مہماں آمدند
در آناں یکے دکتر اقبالِ ہند سخن پرور و واقف از حالِ ہند
ادیبِ سخن گسترِ نکتہ سنج کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گروہ طرزِ رنگینِ اوست شکر پارہ حرفِ شیرینِ اوست

کلامش چو اوجِ بلندی گرفت
سخن رتبهٔ ارجمندی گرفت
زند طعنه آہنگِ او برق را
که خواہاں بود نہضتِ شرق را
نوین شیوهٔ را به سبکِ کہن
درآمیخت از قدرتِ علم و فن
چوں اندر سخن جادهٔ نو گزید
پیامی ز مشرق بمغرب رسید
سخن را درآمیخت چوں با علوم
ازو زنده شد طرزِ مولائے روم
چو فکرش پئے فیلسوفی گرفت
طرازِ سخن طرزِ صوفی گرفت
نوایش ہم آہنگ با نفخِ صور
که افسردگاں را در آرد بشور
چو بلبل بآہنگ کہسارِ ما
ز ہند آمد ایں طوطیِ خوشنوا
دگر آنکه او ناموَرِ سید است
گزیں نخبۂ آلِ سر سیّد است
ہنرمندِ سر راس مسعود نام
کزو مکتبِ ہند دارد نظام
روانِ ہنرمندی و جانِ علم
علیگڑھ بروز و دبستانِ علم
بعالم گر آں مکتب آواز یافت
ز جہدشے ایں قدر و اندازہ یافت
رئیسِ دبستاں در آں مرز و بوم
شناسائے قابل بطرزِ علوم
سوم سیدِ ما که از ندوه است
ز دانش بہ ہندوستاں قدوه است
ز فیضِ وش تازه شد جانِ علم
در اقلیمِ دانش سلیمانِ علم
چه کلکش بمعنی طرازنده شد
خیالاتِ شبلی ازو زنده شد
چه در شاہراہِ حقائق شتافت
معارف ازو رونقِ تازه یافت
مضامینِ او جمله محکم بود
نگارش بکلکش مسلّم بود
دگر مرد دانائے ہادی حسن
پروفیسرے واقف از علم و فن

بانگلیسی و فرس عالم بود   زبانِ دری را معلم بود
ادیبِ سخن پرورِ فارسی   سخنہائے او گوہرِ فارسی
بلفظ دری چوں تکلم کند   ز شوقش شکر دست و پا گم کند
سخنہاش دلکش بیانش ملیح   چو ایرانیاں لہجۂ او فصیح
زبہرِ سیاحت دریں بوم و بر   کشیدند از ہند رختِ سفر
زرہ ایں عزیزاں رسیدند خوش   بکابل کنوں آرمیدند خوش
ورودِ مشاہیر ہندی نژاد   بود رابطہ افزائے حب و وداد
ازیں آمدن دل چوں گل گل شگفت   بصد خرمی خیر مقدم بگفت
غنیمت بود دیدنِ دوستاں   چو در فصل گل جلوۂ بوستاں
مسلماں ز ہر جا بہم دوست بہ   چو بادام توأم بیک پوست بہ
بہمسایہ ہمسایہ گر وا رسد   برش بہرۂ دین و دنیا رسد
کہ از دید و وادید زاید وداد   ز ہم نگسلد رشتۂ اتحاد
دلِ صاف احباب خرم بود   چو در بین ہم رشتہ محکم بود

خوش است اے عزیزان ز ہم پرس و جوے
کہ آید مگر آب رفتہ بہ جوے

اس نظم کے بعد مہمانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن نے ایرانی فارسی زبان میں ایک مفید تقریر کی جس میں نوجوان افغانوں کو شعر و سخن کے بجائے مغربی علوم و فنون کی تحصیل کی ترغیب دی گئی تھی ان کے بیٹھنے کے بعد سید راس مسعود صاحب نے حسب ذیل برجستہ تقریر کی۔

نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود کی جوابی تقریر

محترم بزرگو اور مہربان میزبانو! میں نہایت خلوص سے خوشی کا اظہار اور شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس توجہ کے شکریہ کے فرض سے جو آپ نے خاکسار کے حق میں فرمائی ہیں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، میں چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے دلی جذبات و احساسات آپ تک پہنچاؤں ہمارے درمیان علامہ سید سلیمان ندوی علمائے ہند کے نمائندہ ہیں، اور میرے معزز دوست علامہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں جس نے قدیم و جدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک روح پرور معجون تیار کیا ہے، میں نہ تو علماء کی جماعت سے ہوں اور نہ شعراء کے فرقہ سے بلکہ میں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے، لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمت و احترام سے سرشار اور لبریز ہے آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانان ہند۔ آپ حضرات سے غیر معمولی محبت اور تعلق رکھتے ہیں، اور ہماری دلی آرزو یہی ہے کہ پیارے افغانستان کو مکمل امن و امان اور ترقی و آسایش کی حالت میں دیکھیں، اور چونکہ افغانستان جغرافی نقطہ نظر سے ایشیا اور یورپ کے بیچ میں واقع ہے اس لئے ہماری خواہش ہے کہ افغانستان اسلامی تہذیب و اخلاق کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ٹھیک اسی وقت میں یورپ کے تمام مفید عناصر اور زیبائیوں کا جامع ہو ہر چند کہ میں آپ حضرات کے عنایات کا بے حد ممنون ہوں لیکن میرے دل پر اس غیر معمولی

شخصیت کا جو خوش قسمتی سے اس وقت آپ کا بادشاہ ہے ایسا اثر پڑا ہے کہ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا میں وہ وقت کبھی نہ بھولوں گا جب خوش قسمتی سے میری رسائی اعلیحضرت کی خدمت میں ہوئی مجھے یقین ہے کہ جو سلطنت آپ کا جیسا ملت دوست بادشاہ رکھتی ہو یقیناً وہ سلطنت ترقی کے مدارج پر پہنچے گی اب یہ آپ کا فرض ہے کہ ہمہ تن ہر ممکن ذریعہ سے ان کی خدمت اور اطاعت پر آمادہ رہئے اور اسے باور کیجیے کہ اگر مجھ جیسا ناکارہ تعلیمات کے سلسلہ میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہے تو ان خدمات کے انجام دینے کے لیے میں ہر وقت حاضر اور آمادہ رہوں گا لیکن ایک بات کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا سلطنتِ افغانستان کے جوانوں کو چاہیئے کہ سفید بال والوں کی عزت و احترام کا ہر وقت خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے اُن کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے، تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس کے نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ رہے ہیں، پس گزشتہ سے عبرت پکڑ کر اب اتحاد و اتفاق کو اپنے مقاصدِ قومی کا مرکز بنائے۔

آخر میں دوبارہ آپ کے پُرخلوص عنایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں کبھی آپ کی مخلصانہ مہربانیوں کو فراموش نہ کروں گا۔

سید راس مسعود صاحب کی تقریر کے بعد جو بہت دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کسی مزید تقریر کی ضرورت نہ تھی لیکن حاضرین کے اصرار سے مجھے بھی مجلس ادبی کی مناسبت سے کچھ عرض کرنا پڑا۔

سید سلیمان ندویؒ کی جوابی تقریر

برادرانِ ہمدین و ہموطن و عزیزانِ علم و فن! آج ہم بہت خوش نصیب ہیں جو اس مجمع میں اپنے کو آپ حضرات کے ساتھ دیکھ رہے ہیں چند خادمانِ علم و ادب کو اعلیٰحضرت غازی کا یہاں بلانا، اور پھر ان کا اس ملک کے فضلاء و علماء کے ساتھ اس ادبی جلسہ میں جمع ہونا میرے نزدیک ایک پرشوکت تاریخی دور کا آغاز ہے۔

برادرانِ گرامی! ہندوستان اور افغانستان دو جداگانہ سلطنتیں نہ تھیں بلکہ ایک تھیں، شاید ڈیڑھ دو سو برس کا عرصہ ہوا ہوگا جب ان دونوں ملکوں میں تفرقہ پیدا ہوا یہ دونوں ملک قدیم بدھ دورِ حکومت میں ایک رشتہ میں منسلک تھے جیسا کہ آپ کے ملک میں اس اتحاد کی سنگی یادگاریں زمینوں کے اندر ہر قدم پر دستیاب ہوتی ہیں جو آپ کے عجائب خانہ میں بھی موجود ہیں۔

آغازِ عہدِ اسلام سے تنہا آپ ہی تھے جن کے ذریعے سے نہ صرف مذہب بلکہ علم و فن بھی ہندوستان کے قلب میں داخل ہوئے ہیں سلاطین غزنی اور شاہانِ غوری یہاں رہتے تھے لیکن ان کی حکومت کا دائرہ ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا اسی طرح بابر کا خاندان ہندوستان میں مقیم تھا لیکن اس کا دائرہ حکومت افغانستان تک تھا اور یہ دونوں حکومتیں ایک شہنشاہی کے لئے ایسی تھیں جیسے ایک جسم میں دو ہاتھ ہوتے ہیں۔

آج ڈیڑھ سو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ یہ دونوں ہاتھ اگر

حاد سیاسی کے لئے نہیں تو اتحاد علمی و ادبی اور باہمی محبت کے استحکام
ے لئے پھر مخلصانہ بڑھ رہے ہیں'۔

افغانی بھائیو! آپ کے بزرگوں نے ہندوستان میں صرف جسمانی
ر مادی حکمرانی نہیں کی ہے بلکہ معنوی اور ذہنی حکومت بھی قائم کی ہے
فارسی زبان مدت تک ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان رہی ہے
ر اب بھی ہے یہ زبان صرف آپ کے وسیلہ سے ہم تک پہنچی ہے آپ کے
لما، میں سے میر زاہد ہروی جو آپ کے ہرات کے تھے ان کے رسائل
تصنیفات تین سو سال سے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں فلسفہ کے
سباق کا انتہائی معیار رہیں۔

فارسی زبان کے مشہور اور بڑے شعراء جو اس ملک میں پیدا ہوئے
س طرح جائے پیدایش کے لحاظ سے افغانستان کے کسی شہر کی طرف منسوب
یں اسی طرح سکونت یا مدفن کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی شہر سے نسبت
کھتے ہیں۔

کتنے شاعر ہیں جو غزنی، بلخ، بدخشاں یا آپ کے دوسرے شہروں
ر علاقوں سے تھے اور لاہوری اور دہلوی مشہور ہوئے جس نے عوفی کی
باب الالباب کا مطالعہ کیا ہے اس کو معلوم ہے کہ یہ شعراء ایک رشتہ
حدت میں اس طرح منسلک تھے کہ تاریخ بھی ان میں سے بعض کے لاہوری
ر غزنوی ہونے کا فیصلہ مشکل سے کر سکتی ہے۔

یہ دونوں سلطنتیں باہم اس قدر مربوط تھیں کہ اگر کوئی فاضل یہاں

پیدا ہوتا تو اپنی عمر کا کچھ حصہ وہاں بسر کرتا تھا اور وہاں پیدا ہوتا تو کچھ عرصے کے لیئے یہاں زندگی گذارتا تھا مثلاً مسعود سعد سلمان جو شعرا کے دوسرے طبقے سے ہے اس کو ہندی یا افغانستانی کہنا اور تمیز کرنا سخت مشکل ہے۔

میں نے جلال آباد اور کابل کے باغات دیکھے پہاڑی چشموں، نہروں فواروں، آبشاروں کا نظارہ کیا جو اس سلطنت کی خاک کے ہر ذرّہ سے نمایاں ہیں تو مجھے یقین ہوا کہ خاندانِ بابر نے کشمیر اور ہندوستان میں جو بکثرت باغ لگائے یا جگہ جگہ مصنوعی چشمے بنائے وہ سب افغانستان کے قدرتی مناظر کی نقل تھی۔

جلال آباد میں امیر شہید کے باغات کابل میں بابر کا باغ پغمان کے باغات نیز افغانستان کے دوسرے باغ لاہور کے شالامار سے کیسی قدرتی مشابہت رکھتے ہیں

اور مناظر فطرت کا یہ وطنی ذوق آلِ تیمور میں قدرتی طور پر ایسا موجود تھا کہ اس کو انھوں نے ہندوستان میں عملاً ظاہر کیا یہاں تک کہ دیوان عام اور خاص میں بھی گنگا اور جمنا گلکاری کے ذریعے سے دکھائی گئی ہیں۔

برادران علم و فن! جو کچھ پہلے ہو چکا کیا اب نہیں ہو سکتا؟ سیاسی تفرقہ دوری اور علیحدگی کا ذکر چھوڑیئے! یہ تغیرات عالم کی سرنوشت ہے گاہے چنیں گاہے چناں! سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں! لیکن علمی و ادبی تعلقات

دائم اور برقرار رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا کہ ٹوٹ گئی اور اس کی فتوحات کے اوراق صدیاں ہوئیں کہ بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے اور ان کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے۔

آؤ سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور آل بابر نہیں بلکہ سنائی غزنوی، مسعود سعد سلمان لاہوری، خسرو دہلوی، حسن دہلوی، فیضی اکبرآبادی اور بیدل عظیم آبادی کے نام سے ہم ایک دوسرے کی طرف مودت و محبت کا ہاتھ بڑھائیں۔

افغانستان نے ہمیشہ اپنے جسمانی زور اور مادی طاقت کے متعلق دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے لیکن اب ضروری ہے کہ وہ اپنی دماغی طاقت اور ذہنی پہلوانی کا خراج بھی دنیا سے وصول کرے۔

آپ کی ادبی انجمن تحسین و ستایش کی مستحق ہے کہ اس نے اس راستہ میں قدم اٹھایا ہے اور ہر مہینہ میں اپنی طاقت اور زور کا نہایت خوبی کے ساتھ مظاہرہ کرتی ہے۔

میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ رسالہ کابل، ہندوستان بلکہ ایشیا کے بہترین علمی رسالوں کے دوش بدوش جا رہا ہے اور اس مسرت انگیز دور کے ظہور میں اس کا ہاتھ سب سے زیادہ کارفرما ہے۔

پڑوسی بھائیو! کیا یہ تعجب کا مقام نہیں ہے کہ ہم انگلستان، فرانس

اور جرمنی کے ایک ایک شاعر اور ادیب سے واقف ہوں اور ان کے شاہکاروں پر سر دھنیں لیکن ان دو ہمسایہ ملکوں کے ادبا اور اہل قلم آپس میں ایک دوسرے سے ناآشنا اور اجنبی رہیں حالانکہ ان دونوں کے قدیم بزرگوں کے درمیان نہ صرف وطنی تعلقات تھے بلکہ شاید مذہبی اور نسلی اتحاد بھی موجود تھا۔

لیکن اس سے زیادہ یہ کہ ان کے درمیان ایک ناقابل شکست علمی و ادبی اتحاد تھا اور کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ دو صدیوں سے ہمارے درمیان اس قدر بعد اور دوری ہو گئی ہے کہ نہ ہم آپ کے شعرا اور ادیبوں سے واقف ہیں اور نہ آپ ہمارے۔

ہم کو انجمن ادبی کے رسالۂ کابل کا ممنون ہونا چاہئے جس نے یہاں کے لائق اہل قلم اور شعرا و ادبا سے ہمارا تعارف کرایا اور ہم نے باہم ایک دوسرے کو پہچانا ہے

برادران علمی و فنی! اہل سیاست کو ان کی شعبدہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجئے اور آئیے کہ ہم علم و فن کے نام سے پیمان محبت و دوستی کو تازہ اور عہد رفاقت و آشنائی کو مستحکم کریں، اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم و ادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں دلوں کا اتحاد جس طرح کا بھی ہو بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہے۔

ہندوستان اپنے نوجوانوں کے ذریعہ سے اپنی تعمیر میں مصروف ہے

اور افغانستان بھی لہذا یہ ضروری ہے کہ اس تعمیر میں دونوں ملکوں میں سے ہر ایک کے نوجوان دوسرے ملک کے نوجوانوں کے ساتھ حسنِ ظن اور حسنِ اعتماد رکھیں! اگرچہ اس اتحاد کی راہ میں بہت سے مشکلات پیش آتے ہیں لیکن اس مقصد عزیز کے حاصل کرنے کے لئے ہم کو سیکڑوں طرح کے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے ع

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

میرے بعد ڈاکٹر اقبال کھڑے ہوئے اور اپنے فلسفیانہ اندازِ بیان میں حسب ذیل تقریر ارشاد کی جو اس موقع پر بہت پر اثر ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کی تقریر

سید سلیمان صاحب ندوی اور ڈاکٹر سر راس مسعود کی تقریروں کے بعد جن میں ہمارے جذبات کی نہایت خوبی سے ترجمانی کی گئی ہے اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جس کو میں بیان کروں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھ سے بھی یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم اور خوش آمدید انھوں نے جس لطیف اور بلیغ ترین انداز میں کیا اور کہا ہے۔ اس کے جواب میں میں بھی کچھ عرض کروں میں انجمن ادبی کابل کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے اپنی مہربانی سے میرے متعلق نظم و نثر میں اچھے خیالات اور پر احساس جذبات ظاہر کئے ہیں۔

میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ صرف اور صرف انجمن ادبی کابل کے

نوجوان ارکان کے عملی پہلو (فعالیت) اور کارروائیوں سے بحث کروں، کوئی شک نہیں کہ انجمن اپنے کام کی اہمیت اور ذمہ داری سے بخوبی آگاہ ہے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی اور یا معماری جو بھی ہو ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہیئے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے، اس وقت جب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوان کے لئے سچے رہنما بنیں زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ "آرٹ" جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ "سخت خوفناک اور بربادکن" ہو جاتا ہے، اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے۔

دلبری با قاہری پیغمبری است　　دلبری بے قاہری جادوگری است

میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول کراؤں حیات نبوی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے، روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور میں امرؤ القیس کے جو مشہور عرب شاعر ہے کچھ اشعار پڑھے گئے، ارشاد ہوا۔ اشعر الشعراء و قائدھم الی النار

ترجمہ تمام شاعروں میں بہتر شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا۔

اس ارشاد سراسر رشاد سے واضح طور پر روشن ہوتا ہے کہ شعر کا کمال

بعض اوقات لوگوں پر برا اثر ڈالتا ہے، ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل وصورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقتۃً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ، وہ "تخیل" ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو ونما پا کر مر جاتی ہیں، پس یہ خواہش ہے کہ نوجوان افغانستان کے شعرا وانشا پرداز ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ رفتہ رفتہ اخیر میں اپنے کو پہچان سکیں جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی "انانیت" خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے پس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوان نسلوں کی فکروں کو ادبیات کے ذریعہ سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی "انانیت" کو پا کر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں۔

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا   فساں کشید و بروی زمانہ آخت مرا
من آں جہانِ خیالم کہ فطرتِ ازلی   جہانِ بلبل و گل را شکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرِ حرمم   تواں ز گرمیِ آوازِ من شناخت مرا

میں ایک اور نکتہ بھی کہنا اور گذر جانا چاہتا ہوں موسیولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اٹلی کو چاہیئے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اٹلی کے گریبان کو اینگلو سکسن اقوام کے قرضہ جات کے چنگل سے چھڑا سکے یا کسی دوسرے

دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو حاصل کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ چلائے، اگر آپ مجھ سے افغانستان کی نجات کے متعلق سوال کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کرے لیکن مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا مجھے یقین ہے کہ اعلحضرت نادر شاہ کی شخصیت ایجاد کار کو اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ افغانستان کا ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے تعارف کرائیں اس وطن کے نوجوانوں کو چاہیئے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں کیونکہ ان کی تمام زندگی ایثار اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے“

ان تقریروں کے بعد لوگ کھانے کے لئے اٹھے کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا سامان یعنی آفتابہ اور سلفچی موجود تھا کھانے کا اہتمام ہوٹل کے وسطی کمرہ میں تھا چاروں طرف پورے حلقہ میں بصورت دائرہ میز بچھی تھی اور اس کی چاروں طرف کرسیاں لگی تھیں، پورا دائرہ مہمانوں سے بھرا تھا، میرا اندازہ ہے کہ پچاس ساٹھ آدمی دعوت میں شریک ہونگے کھانے سب ہندوستانی طرز کے مطابق پہلے ہی سے دسترخوان پر لگا دیئے گئے تھے کھانے میں مختلف اقسام کے گوشت، کباب، مرغ اور مختلف انواع کے پلاؤ اور بعض یورپین مذاق کی چیزیں تھیں کھانے میں خاص افغانستان کی

کوئی ممتاز چیز نہیں معلوم ہوتی تھی، اور ہم کو ان میں اور ہندوستان کے دسترخوان اور الوان نعمت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

میرے پاس ایک پیر کہن سال افغان بزرگ تھے جو ہندوستان میں سالہا سال رہ چکے تھے، سرسید احمد خاں مرحوم سے ملے تھے، اور حکیم اجمل خاں مرحوم سے بھی ان کی محبت اور دوستی تھی اردو اچھی بولتے تھے اور با ایں ہمہ سن و سال ضعف قویٰ اور ضعف اشتہا کا کوئی عملی گلہ ان کو نہ تھا۔

کھانے کے بعد پھر پہلے کمرہ میں آ کر لوگ بیٹھے اور اب مجلس پہلے کی طرح باقاعدہ نہ تھی میں وسط مجلس میں ایک اور جگہ جا کر بیٹھا جہاں ایک مصری فاضل زیدان بدران (رکن دائرہ تعلیم و تربیت و دارالتالیف) نامی اور ایک بخاری فاضل جو عربی کے شاعر و ادیب تھے بیٹھے تھے ان سے دیر تک عربی میں گفتگو ہوتی رہی بخاری فاضل بالشویک حکومت سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں تھے اپنے ملک کے دردناک قصے سناتے تھے اور کہتے تھے کہ عنقریب ہندوستان آ کر ملیں گے موصوف کی تعلیم شام میں ہوئی تھی۔

جس طرح ہندوستان میں پان یا الائچی کھاتے ہیں یہاں بادام اور پستے بھنے ہوئے تشتریوں میں رکھے ہوتے ہیں جن کو لوگ شغل اور تفکہ کے لئے کھاتے رہتے ہیں، یہاں پان کا وجود نہیں ہے حقہ بھی ہم نے نہیں دیکھا، البتہ نئے لوگوں میں سگریٹ اور سگار کا رواج خاصہ ہے ڈاکٹر

اقبال صاحب کا دلپسند مشغلہ حقہ ہے ان کا حقہ بھی ان کا رفیق سفر تھا، چائے کے متعلق یہاں رواج یہ ہے کہ پہلی پیالی تو میٹھی ہوتی ہے پھر دوسری پیالیاں بے شکر کے تلخ پی جاتی ہیں؟

مہمانوں میں ایک شنواری مولوی صاحب بھی تھے دہلی اور دیوبند میں تعلیم پائی تھی کہتے تھے کہ شاہ امان اللہ خاں نے اپنے اصلاحات کی نسبت مجھ سے فتویٰ پوچھا تھا تو میں نے "دین و دولت" دونوں کے فائدوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے متعلق اپنی رائے لکھی اور ہر مسئلہ کے سامنے اس کا جواب لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا شاہ ممدوح اس کو پڑھ کر نہایت برہم ہوئے اور مجھے نظر بند کر دیا۔

یہ مجلس دس بجے تک قائم رہی جس کے بعد سب لوگ ایک دوسرے سے مل کر رخصت ہوئے ہم لوگ بھی اپنے قیام گاہ دارالامان میں واپس آئے رات آرام بسر کی سردی ہمارے صوبہ کے دسمبر کی راتوں سے زیادہ نہ تھی پلنگ پر جو کمبل لگے ہوئے تھے، وہ کافی تھے۔

باغ بابر۔ آج اکتوبر کی ۱۹ر تاریخ تھی سرور خاں سے طے تھا کہ آج کابل کے بعض قابل دید مقامات کی سیر ہوگی صبح کی چائے اور ناشتہ سے فارغ ہوکر جو ہر شخص کو علٰحدہ علٰحدہ اس کے کمرہ میں پہنچا دیا جاتا تھا میں باہر نکلنے کے لئے تیار ہوگیا تھوڑی دیر میں سرور خاں آئے اور اُن کے ساتھ سب سے پہلے "باغ بابر" گیا، یہ باغ موجودہ آبادی سے باہر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، دامن میں باغ اور فوارے ہیں، اور اس سے

ونچائی پر باغ کی عمارت ہے اور اس سے اوپر پہاڑی کے بالکل نیچے ایک احاطہ میں شہنشاہ بابر کا کھلا مزار اور باغ کے بیچ میں جو عمارت ہے سنا ہے کہ امیر عبدالرحمن خاں نے بنوائی ہے اس اونچی عمارت اور زیرین باغ اور فواروں کو دیکھ کر شالامار باغ لاہور کا ایک چھوٹا سا منظر نظر کے سامنے آگیا۔

میرے کابل پہنچنے سے پہلے اسی باغ میں کابل کی بلدیہ (مینوسپلٹی) کی طرف سے ہمارے رفقاء کو گارڈن پارٹی دی گئی تھی لیکن چونکہ میں اس میں شریک نہ تھا اس لئے اس کی تفصیلات کی مجھے اطلاع نہیں۔

عمارت مذکورہ اور مزار کے بیچ میں ہندوستان کی مغل عمارتوں کے نمونہ کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے یہ مسجد شاہ جہاں نے سنہ ۱۰۵۶ھ میں بنوائی تھی مسجد کی بیرونی چھت کے سامنے کی بلندی پر بادشاہ مذکور کا تاریخی کتبہ مع سال بنا کندہ ہے مسجد سے اوپر بلندی پر بابر کے مزار کا احاطہ ہے اوپر پہاڑ سے سنگ ستانی چشمہ اترتا ہوا نیچے بہہ رہا ہے احاطہ کے اندر بے سقف کی خالی زمین ہے، اس کے بیچ میں شہنشاہ بابر کا سادہ سنگی مزار ہے، جن لوگوں نے بابر کے بیٹوں اور پوتوں کے مزارات دہلی آگرہ اور لاہور میں دیکھے ہیں وہ ان کے مورثِ اعظم کے اس سادہ بے گنبد وعمارت قبر کو دیکھ کر بے اختیار اشکِ عبرت بہائیں گے لیکن اتنی تسکین کیا کم ہے کہ بارہ ہزار کی جمعیت سے ۳۲ کروڑ کے ہندوستان کو فتح کرنے والا آج بھی اپنی قوم کے آزاد ملک کی آزاد سرزمین میں آرام کر رہا ہے اپنی ایک

خود مختار سلطنت کے بنا و تعمیر میں جو بارہ برس تک خشک پہاڑیوں سے سر ٹکراتا رہا وہ مرنے کے بعد بھی ایک پہاڑی ہی کے نیچے پتھروں کا مسند اور تکیہ لگائے محوِ خواب ہے۔

یہ مزار جہانگیر کے عہد تک کتبہ سے بھی خالی تھا جہانگیر نے سرھانے پتھر کا ایک کتبہ نصیب کرایا ہے جس پر حسب ذیل فارسی شعر منقوش ہیں۔

بادشاہے کز جبینش تافتے نورِ الٰہ — آں ظہیر الدیں محمد بود بابر بادشاہ
باشکوہ و دولت و اقبال و عدل و داد و دیں — داشت از توفیق و فیض و فتح و فیروزی سپاہ
عالمِ اجسام را بگرفت و شد روشن رواں — بہرِ فتحِ عالمِ ارواح چوں نورِ نگاہ
شد چو فردوسش مکاں رضواں ز من تاریخ جست — گفتمش فردوس دائم جائے بابر بادشاہ

بابر کے مزار کے ایک پہلو میں ذرا دور ہٹ کر ہندال مرزا اور ہمایوں کے بھائی حکیم مرزا کے مزارات ہیں ان کی قبروں پر بھی جہانگیر نے کتبے لگائے ہیں اور دوسرے پہلو پر دہلی کے عالمگیر ثانی کی دختر گوہر النساء بیگم کی قبر ہے، مرزا کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

"مرقد گوہر النساء بیگم بنت عالمگیر ثانی بتاریخ ۲۷ شعبان ۱۲۰۲ھ"

معلوم نہیں یہ "درِ مکنون" دہلی سے کابل کو کیونکر منتقل ہوا

شہنشاہ بابر کے خاندان کا یہ گورِ غریباں دیکھ کر دل بیحد متاثر ہوا مغفرت کی دعا مانگ کر آنسوؤں کے دو پھول مرقد شاہی پر چڑھائے اعلیٰحضرت نادر خاں مرحوم نے اپنے زمانہ میں اس مزار کی درستی کرائی ہے اور اس پر نہایت عمدہ قیمتی پتھروں کے پھول لگائے ہیں۔

مزار سے باہر آکر چشمہ سے گزرتے ہوئے نیچے اترے اور موٹر نے ب شہر خموشاں کے بجائے شہر آباداں کی طرف کوچ کیا۔

مکتب صنائع نفیسہ۔ افغانستان میں مکتب کا لفظ مدرسہ یا اسکول کے معنوں میں بولا جاتا ہے مزار بابر سے نکل کر ہم سب سے پہلے مکتب صنائع نفیسہ میں پہنچے، صنائع نفیسہ کے معنی فنون لطیفہ یا "فائن آرٹس" سمجھئے اس مدرسہ کو شاہ امان اللہ خاں نے قائم کیا تھا پتھر کی اچھی خاصی دو منزلہ عمارت ہے سامنے لڑکوں کے کھیلنے کا میدان ہے یہ میدان احاطہ سے گھرا ہوا ہے اور احاطہ ایک پھاٹک سے بند ہے موٹر جیسے ہی پھاٹک پر آکر رکا بعض اساتذہ نے جو میدان میں کھڑے تھے اور مدیر مکتب جناب غلام محمد خاں صاحب نے پرتپاک استقبال کیا اور ایک ایک کلاس میں لے جاکر پورے اسکول کی سیر کرائی کل پانچ سو لڑکے اس میں اس وقت زیر تعلیم تھے اور فنون لطیفہ میں سے نقاشی، نجاری، قالین بافی، رنگریزی اور مصوری وغیرہ کے مختلف کلاس زیر تعلیم تھے نقاشی جس کو وہاں رسامی کہتے ہیں اس کے معلم ایک ہندوستانی تھے، قالین بافی کے اعلیٰ استاد ایرانی تھے اور نجاری کے اعلیٰ کلاس میں ایک جرمن تعلیم دے رہا تھا میں نے ہر ایک کلاس میں جاکر لڑکوں کے کاموں کو دیکھا میں نے لکھنؤ کا سرکاری آرٹس اسکول دیکھا ہے، مجھے یہاں کے صنائع نفیسہ کا کام وہاں سے بہتر نظر آیا جس درجہ میں بھی ہم لوگ پہنچتے اس میں ایک طالب علم ایک خاص نعرہ خیر مقدم لگاتا تھا جس کو سننے کے ساتھ تمام طلبہ ادب سے سلام

کرتے تھے میں نے اس نعرہ کے غیر مفہوم لفظ کا مطلب پوچھا تو بتایا گیا کہ اس کے معنی خبردار اور ہوشیار کے ہیں۔

مصوری کے کلاس میں ایک بوڑھا پٹھان لڑکوں کے سامنے بلندی پر چپ چاپ پڑا تھا اور سب طلبہ پنسل لئے ہوئے ایک ایک ادا کی تصویر اتار رہے تھے۔

قالین بافی کے کلاس کو پورا دیکھا اون یہیں رنگا جاتا ہے اور یہیں اس کا سوت تیار ہوتا ہے اور پھر آخر تک اس کے پورے مراحل یہیں طے ہوتے ہیں یہ رنگ یورپین ساخت کے نہیں ہوتے بلکہ پرانے طرز پر ملکی نباتات سے رنگ کر اور اُن کو گرم پانی میں جوش دے کر نہایت روشن چمکدار پختہ رنگ اون تیار کرتے ہیں قالین بنتے ہوئے میں نے سب سے پہلے یہیں دیکھا چھوٹے بڑے قالینوں کے اندازہ سے چوکھٹے دیواروں سے لگے کھڑے تھے ان میں اونی دھاگے کے تانے اوپر سے نیچے کی طرف تنے ہوئے تھے پھر چند لڑکے ایک ایک قالین کے چوکھٹے کے پاس بیٹھ کر اُس کے تانے بھرنے میں مصروف تھے ہر قالین کے شروع کرنے سے پہلے اس قالین کا نقشہ اور ڈیزائن بنایا جاتا ہے یہ نقشہ پہلے تیار کر لیا جاتا ہے، اس میں ہر رنگ کی جگہ اور مقدار اور پھولوں کی صورت اس طرح نقش کیجاتی ہے جس طرح مصوری کا چارٹ یا نقشہ خطوط اور نقطوں کی صورت میں بنایا جاتا ہے، استاد یا کسی مستعد لڑکے کے ہاتھ میں وہ نقشہ ہوتا ہے اور وہ ایک خاص زبان اور اصطلاح میں ہدایات پڑھتا جاتا ہے اور لڑکوں کے

ہاتھ ان کے مطابق مشین کی طرح اونی تاروں پر حرکت کرتے جاتے ہیں اور مختلف نقش ونگار ان کے ہاتھوں کے نیچے بنتے جاتے ہیں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ترکی زبان کے الفاظ و اصطلاحات تھے یہاں کے بنے ہوئے قالین اپنی خوبی، رنگینی، خوشنمائی اور دیرپائی میں ایرانی اور ترکی قالینوں کا مقابلہ کرتے ہیں افسوس ہے کہ یہ ابھی تک اتنے زیادہ تیار نہیں ہوتے جو بازاروں میں اور بیرونی ملکوں کے مارکیٹ میں بھیجے جائیں

نجاری کے کارخانہ کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا، لکڑی اتنی اچھی جو میں نے ہندوستان میں نہیں دیکھی، ٹیک کی لکڑی جو بمبئی اور برما میں سب سے بہتر سمجھی جاتی ہے اس سے وہاں کی لکڑی بہتر تھی یعنی پختہ وزنی اور آہنی چکنی کہ چیرنے کے بعد رندے اور خراد کے بغیر وہ رندی اور خرادی ہوئی معلوم ہوتی تھی لکڑی کے گود میں ایسی خوشنما لکیریں کہ وہ بجائے خود نقش معلوم ہوتی تھیں اس صیغہ میں لکڑی چیرنا، کاٹنا، چھیلنا، ٹکڑے کرنا اور ٹکڑوں کو جوڑنا تو معمولی کام تھے آخری کام فرنیچروں کے نقشے اور ڈزائن تیار کرنے اور ان کے مطابق عمدہ فرنیچروں کی ساخت ہے اس آخری کلاس کا معلم ایک جرمن تھا حکومت کا اثر یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کلاس کے اندر قدم رکھا اس نے السلام علیکم کہہ کر استقبال کیا۔

صنائع نفیسہ کے اکثر کلاسوں کو دیکھ کر باہر نکلا تو میدان میں اس عظیم الشان اضافہ کو دکھایا گیا جو موجودہ حکومت اس مدرسہ کی عمارات میں کر رہی ہے یہ عمارات زیر تعمیر معلوم ہوتی تھیں جب کبھی وہ مکمل ہو جائیں گی تو

اس مدرسہ کی ظاہری حیثیت بھی بہت بلند ہو جائے گی اور مدرسہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

سرکاری موٹر خانہ۔ یہاں سے واپسی میں موٹر خراب ہو گئی شوفر اس کو لے کر سرکاری موٹر خانہ میں گیا یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس میں بہت سے گیرج بنے ہوئے ہیں یہاں خراب موٹروں کی مرمت کی جاتی ہے افسر موٹر خانہ بڑی توجہ اور التفات سے پیش آیا سرور خاں کے کہنے سے اس نے خراب موٹر کو مرمت کے لئے لے لیا اور دوسرا عمدہ موٹر اس نے بدل کر دیا، موٹروں کی مرمت و اصلاح کا یہ کارخانہ بھی موجودہ حکومت کی پیداوار ہے

نئی دکانوں کی عمارتیں۔ موٹر خانہ جاتے ہوے راستہ میں دکانوں کی جدید عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ نظر آیا، یہ یورپ کی دکانوں کے طریق پر بنائی گئی ہیں باہر دروازوں میں پورے پورے شیشے لگے ہیں، تاکہ دکانوں کے بند ہونے کے باوجود اندر کی چیزیں شایقین کو نظر آسکیں یہ عمارتیں بھی موجودہ حکومت نے دکانوں کے لئے بنوائی ہیں ابھی ان کی تعمیر پوری ختم نہیں ہوئی ہے یہ دکانیں جب آباد ہو جائیں گی تو کابل پر بمبئی یا کسی یورپین شہر کا دھوکہ ہوگا۔

ہوائی جہازوں کا میدان۔ ان دکانوں کے بالمقابل دوسری طرف ابھی کوئی جوابی لائن نہیں بنی ہے اسی کے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے جس کو برابر کرکے مسطح کیا گیا ہے اور اس کو ہوائی جہازوں کے اترنے اور اڑنے کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

بالاحصار کا مکتب حربی ۔ اس کے آگے بڑھ کر بالاحصار کی پہاڑی اور میدان آیا یہ مقام کابل کا سب سے بلند مقام ہے، اس کے پاس ہی جھیل یا تالاب سا پانی پھیلا تھا یہ پہلے کابل کے امراء اور والیوں کا حاکم نشین قلعہ تھا یہ قلعہ تاتاریوں کے حملہ کے وقت بھی موجود تھا مگر در اصل بابر نے اس کو مضبوط و مستحکم کیا تھا، ہمایوں نے اپنے بھائی پر جب حملہ کیا تھا تو وہ اس وقت اسی قلعہ میں تھا یہی وہ قلعہ تھا جس میں خرد سال اکبر کو ظالم چچا نے باپ کی توپوں کے گولوں کے رخ پر اس لئے بٹھا دیا تھا کہ ہمایوں کی توپیں قلعہ پر گولے سر نہ کر سکیں، اکبر نے تخت نشین ہو کر اس کو از سر نو درست کیا جب جہانگیر تخت آرا ہوا تو اس نے کاشی کاری کے کاموں سے اس کو زینت دی شاہجہاں کے زمانہ میں علی مردان خاں حاکم کابل نے جو شاہجہاں کا میر عمارت بھی رہ چکا تھا یہاں بہت سی نئی عمارتیں بنا کر کھڑی کیں اور کابل کا موجودہ مشہور چہار چھتہ بھی اسی کی تعمیر ہے اور اسی کے قریب اورنگ زیب نے مسجد گدری بنوائی۔

بہرحال اس وقت سے لے کر آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر تک ت قام کابل کے امراء اور حکام اور سلاطین سدوزی کا دار الحکومت اور تقر و قیامگاہ رہا سنہ ۱۲۹۶ ہجری (۱۸۷۹ء) میں جب انگریزوں نے اپنے قتول سفیر کیونری کے انتقام میں کابل پر چڑھائی کی تو اس تاریخی قلعہ کو رود لگا کر اس طرح اڑا دیا کہ وہ راکھ کا ڈھیر اور پتھروں کا انبار ہو کر ہ گیا اس وقت سے لے کر آج تک یہ مقام اسی طرح ویران پڑا تھا اور

محض عبرت گاہ ایام تھا، سال گزشتہ اعلیحضرت نادر خاں شہید مرحوم نے اس مقام کی تاریخی حیثیت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اس کو مکتب حربی (ملٹری کالج) قائم کرنے کے لئے موزوں سمجھا چنانچہ سال گزشتہ ۷ اہر ثور کو اعلیحضرت شاہ شہید نے خود اپنے ہاتھوں سے اس تاریخی مقام میں مکتب حربی کا سنگ بنیاد نصب کیا اور تمام حکام و اشراف و ارباب مناصب اور پرجوش اہل شہر نے اپنے ہاتھوں میں کدالی اور پھاوڑے لے کر اس زمین کو ہموار و مسطح کیا گویا یہ دن کابل کے قومی جوش و خروش کا سب سے بڑا تاریخی مظاہرہ تھا جس وقت میں اس میدان میں پہنچا میرے رفیق سرور خاں نے قومی افتخار کے ساتھ اس میدان کی طرف اشارہ کیا اور افغانوں کی چھ سو برس کے ان روایات ملی کو جو اس مقام سے وابستہ ہیں، بیک جنبش نگاہ دہرا دیا ابھی تک مکتب کی عمارت کی طرح نہیں ڈالی گئی ہے اگر شاہ کی شہادت کا یہ غمناک حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید تعمیر کا کام جلد شروع ہو جاتا۔

دو صحابیوں کے مزار۔ بالاحصار کی پہاڑی کے نیچے نیچے موٹر نے حرکت شروع کی اور بالاحصار کے کھنڈر کی دوسری طرف پہنچ کر ایک ایسے مقام پہنچے جہاں شاید پہلے آبادی ہو مگر اس وقت وہ بے نشان ہے، اس سے آگے بڑھ کر ایک پرانے قبرستان کے پاس پہنچے جو پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اس قبرستان میں ایک طرف مشہور ہے کہ دو صحابیوں کے مزار ہیں افغان میں ان کے نام حضرت تمیم اور حضرت جبیر مشہور ہیں گو تاریخ سے ان بزرگوں کی

شخصیت کا ثبوت بہم پہنچانا دشوار ہے تاہم شہرت عام کی قطعی تکذیب بھی مشکل ہے بہرحال وہ صحابی ہوں یا تابعی ہوں شاہ شہید کی حکومت نے عقیدت عام کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی قبروں کی مرمت کرائی ہے اور جس وقت میں پہنچا ہوں اس کے چاروں طرف عمارت کا کام جاری تھا اور معمار اس کے سامنے ایک فوّارہ بنانے میں مصروف تھے دعائے سنون پڑھ کر یہاں سے واپس ہوا۔

سفراء کے مکانات۔ یہاں سے واپسی میں اس سڑک سے گزر ہوا بدھر اکثر دولِ غیر کے سفراء کے مکانات ہیں میرے رفیق نے بتایا کہ لمطنتیں اپنے ہاں افغانی سفراء سے مکانات کی نسبت جو برتاؤ کرتی ہیں ہی اُن کے سفراء کے ساتھ یہاں برتا جاتا ہے یعنی اگر وہ مکانات کے رائے لیتی ہیں تو افغانی حکومت بھی ان سے یہاں کرایہ لیتی ہے، ورجو افغانی سفروں کو بے کرایہ مکان دیتی ہیں تو ان کو بھی یہاں بے کرایہ مکان دیا جاتا ہے، چنانچہ جب ہم ایرانی سفیر کے قیام گاہ کے نچے سے گذرے تو بتایا گیا کہ ایرانی حکومت چونکہ افغانی سفیر سے کان کا کرایہ نہیں لیتی تو یہاں بھی اس کے سفیر کو یہ مکان دوستانہ بے کرایہ دیا گیا ہے۔

امان اللہ خاں کے زمانہ ہی سے انگریزی سفارت خانہ ایک رمقام پر اٹھ گیا ہے، جو کوہِ دامن اور مکتب حربی کے درمیان ہے رنہیں کہا جا سکتا کہ وہ مقام دونوں سلطنتوں کے سیاسی مفاد کے

لحاظ سے کہاں تک مناسب ہے۔

رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند

دارالعلوم عربی۔ اب میں نے یہاں کے عربی مدرسہ کے دیکھنے کی خواہش کی جس کا نام "دارالعلوم" ہے یہ مدرسہ پرانے شہر کے اندر ایک گلی میں واقع ہے سڑک کی ایک گلی پر پہنچ کر موٹر رک گیا یہاں سے اتر کر گلی میں قدم رکھا تھوڑی دور چل کر ایک بڑے مکان کے اونچے دروازہ کے اوپر دارالعلوم عربی کا سائن بورڈ نظر آیا اندر سے عمارت خاصی بڑی تھی، دو منزلہ عمارت ہے اور دونوں میں مدرسہ کی جماعتیں مصروف درس تھیں رئیس مدرسہ کا نام قاری عبدالرسول خاں ہے اور مدرسین میں اکثر وہ افغانی علماء تھے جنھوں نے ہندوستان میں تعلیم پائی ہے مدرسین فارسی زبان میں تقریر کر رہے تھے طلبہ کے سروں پر سپید افغانی گول پگڑیاں اور جسم میں گرم یا روئی دار لبادے تھے اور ادب سے بیٹھے ہوئے استاد کی تقریریں سن رہے تھے۔

سب سے پہلے جس جماعت میں پہنچا اس میں مشکوٰۃ کا درس ہو رہا تھا اور مقام وہ تھا جہاں اوقات ثلٰثہ (زوال، طلوع اور غروب میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے پھر اس کے مقابل وہ حدیث تھی جس میں بیان ہے کہ اگر طلوعِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت صبح کی ادا کر لی، یا غروب سے پہلے عصر کی ایک رکعت تمام کر لی ہے تو دونوں نمازیں ہو جائینگی چونکہ امام ابو حنیفہ کا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ عصر کی نماز تو ہو جائیگی

مگر صبح کی نہیں ہو گی اور اس لئے مدرس صاحب نے علمائے احناف کے مشہور طریقہ استدلال کو کہ چونکہ یہ دونوں حدیثیں یعنی منع صلوٰۃ اور اس ایک رکعت کے پا لینے پر پوری نمازیں درست ہو جانے والی حدیث میں تعارض ہوا تو ہم نے قیاس کی طرف رجوع کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ عصر کی نماز ناقص وقت میں شروع کی گئی اور ناقص وقت میں تمام ہوئی اس لئے درست ہوئی اور صبح کی نماز صحیح وقت میں شروع ہوئی اور ناقص میں تمام ہوئی اس لئے وہ درست نہیں ہوئی، میرا جی چاہا کہ عرض کروں کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض سرے سے نہیں، حدیث منع کا منشا یہ ہے کہ عین زوال اور طلوع اور غروب کے وقت نماز شروع نہ کیجائے اور دوسری حدیث کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی نے طلوع یا غروب سے پہلے نماز شروع کی تھی کہ ایک رکعت بعد دوسری رکعت میں آفتاب طلوع یا غروب ہو گیا تو نماز توڑی نہ جائے تمام کی جائے اور وہ نمازیں درست ہوں گی لیکن افغان علماء کے تشدّد کا خیال کر کے میں نے جرأت نہ کی سردار خاں نے کہا بھی کہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، لیکن میں نے تردید کی کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔

یہاں سے اُٹھ کر اوپر کی منزل میں گیا وہاں ہدایہ کا درس جاری تھا وہاں بھی خاموش رہا اس کے مقابل کے دوسرے کمرے میں ہیئت قدیم میں شرح چغمنی ہو رہی تھی سبق ختم ہوا تو مولانا نے خوش اخلاقی کیساتھ مصافحہ کیا اور گفتگو کی اتنی نرمی پاکر میں نے عرض کیا کہ "حضرت اب تو

آسمان ہی سرے سے مسلم نہیں اور آپ تو آسمانوں کی ترتیب پر استدلال قائم فرما رہے ہیں" فرمایا کہ کیا کیا جائے یہاں جب تک ان علوم کو نہ پڑھیں ہم کو ملا ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

مدرسہ کے نصاب جاری کا نقشہ دیکھا وہی کتابیں تھیں جو ہندوستان کے قدیم عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں طلبہ میں دو باتیں عجیب معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ کوئی طالب علم بھی پچیس تیس چالیس برس سے کم کا نہیں معلوم ہوا سب کی اچھی خاصی بڑی داڑھیاں دوسرے یہ کہ ان طالب علموں میں تیزی اور ذہانت کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہمارے ہاں کے عربی مدرسوں میں یوں بھی اگر کوئی باہر کا آدمی آجائے تو جید طالب علم اپنی ذہانت اور تیزی کی نمائش کے لئے استاد سے سوالات اور اعتراضات اور جوابات کی بڑی قوت دکھاتے ہیں افغان عربی طلبہ کی یہ سرد طبعی حقیقت میں ان کی دماغی قوت کی کمزوری کے سبب سے نہیں ہے بلکہ طریقہ تعلیم کی کمزوری اور طرز تربیت کی خرابی سے ہے ورنہ وہی افغان طلبہ جب نئے علوم پڑھتے ہیں تو ان کی فطری ذہانت اور تیزی آخر پوری طرح ظاہر ہوئی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس مدرسہ کے نظام تعلیم میں اصلاح کی جائے اور اس کے نصاب میں نئے علوم کو داخل کیا جائے اور ضرورت کے مطابق ان طلبہ کے رہنے سہنے کے طور طریق میں صفائی اور بلندی کا خیال رکھا جائے وہاں علماء کے طبقہ کو ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ یا تو شیشہ ہے کہ ذرا

اتھ لگایا اور ٹوٹا، یا بارود ہے کہ اس میں بے احتیاطی سے ذرا گرمی پہنچی تو بھک سے اڑ جائے گا، اور زلزلہ پیدا کر دے گا یہ خطرہ ایک حد ک صحیح ہے لیکن اگر افغانستان کو زندہ رہنا ہے تو اس خطرہ سے ایک دفعہ و چار ہونا لازمی ہے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ طریقہ تعلیم نظام لیم اور نصاب تعلیم میں رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے اور ایسے علماء یدا کئے جائیں جو نئی تعلیم کے نوجوان افغانوں کی رہبری کر سکیں اور فید اصلاحات کی پیش رفت میں مدد دے سکیں ہمائے افغانستان نے زشتہ دورہائے حکومت میں بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں کوئی جہ نہیں کہ آج پھر وہی کام وہ انجام نہ دے سکیں نظم و اصلاح دین و انش اور علم و فن کے آج کتنے کام ہیں جو ان کی نگہ التفات کے منتظر ہیں

دید مدارس۔ اس عربی مدرسہ دارالعلوم کے علاوہ یہاں جدید لیم کی بھی چند درسگاہیں ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

تب حبیبیہ، مکتب نجات، مکتب استقلال، مکتب دارالمعلمین، مکتب غازی تب صنائع نفیسہ، مکتب زراعت، مکتب طبی، دارالحفاظ، یتیم خانہ نادری تب دواسازی، مکتب حربیہ، مکتب قبائل یہ تو بڑے مدرسے ہیں ن کے علاوہ شہر میں تین ابتدائی مدرسے بھی ہیں،

افغانستان میں مکتب کا لفظ ہائی اسکول اور کالج کے لئے بولا جاتا ے، ہمارے ہندوستانی ناظرین ان مکتبوں سے اپنے ہاں کے بچوں کے تب نہ سمجھیں۔

ان مکاتب میں سب سے پرانا مکتب حبیبیہ ہے جو امیر حبیب اللہ خاں کی یادگار ہے انھیں کے زمانے میں بنا تھا یہاں پہلے بھی اور اب بھی زیادہ تر ہندوستانی مسلمان معلم و مدرس ہیں انگریزی تعلیم ہوتی ہے، مکتب حربیہ یعنی فوجی کالج بھی یہاں پہلے سے ہے، امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں ایک فرانسیسی اور دوسرا جرمن زبان کے لئے دو اسکول قائم کئے تھے جن میں سے ایک کا نام امانیہ اور دوسرے کا امانی رکھا تھا مگر اب جرمن کالج کا نام مکتب نجات اور فرانسیسی کالج کا نام مکتب استقلال ہے، مکتب دار المعلمین میں استاد تیار ہوتے ہیں مکتب صنائع نفیسہ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، مکتب زراعت کاشتکاری و باغبانی کی تعلیم کے لئے ہے، کابل و پغمان کے بیچ میں اس کی عمارت ہے، مکتب طبی شاہ نادر خاں کے عہد کی یادگار ہے یہ دار الامان میں واقع ہے اور جس دار الفنون کابل یعنی کابل یونیورسٹی کا تخیل شاہ مرحوم کو تھا اسکی بنیاد اولین کے طور پر پہلے اسی طبی کالج کا شعبہ قائم کیا گیا ہے اور یہ کھل گیا ہے اور اس کا کام عمدگی سے جاری ہے اسی کے ساتھ دواسازی کا بھی ایک مدرسہ کھول دیا گیا ہے تاکہ دوائیں خود افغانستان میں تیار ہو سکیں۔

دار الحفاظ میں صرف حفظ قرآن کے لئے لڑکے جاتے ہیں اور حافظ ہوتے ہیں، یتیم خانہ خاص نادر خاں مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے اس میں شہر کے یتیم بچے رہتے اور پڑھتے ہیں اور مکتب صنائع میں صنعت و حرفت سیکھتے ہیں مکتب حربیہ جس میں فوجی تعلیم ہوتی ہے بہت بڑے پیمانہ پر قائم ہے، ترک ایطالوی، جاپانی اور جرمن استاد ہیں نادر خاں نے اپنے زمانہ میں مکتب قبائل

کے نام سے ایک اور جنگی اسکول قائم کیا تھا، اس میں سرحد کے بڑے بڑے سرداران قبائل کے بچوں کو مفت فوجی تعلیم دیجاتی ہے، سرور خاں گویا نے مجھے بتایا کہ اس میں اس وقت تین سو بچے زیر تعلیم ہیں۔

مکتب نجات اور مکتب استقلال جن کے پہلے نام امانیہ و امانی ہیں، جرمن اور فرنچ تعلیم کے لئے مخصوص ہیں، استقلال سے مقصود اخیر جنگ انگریز و افغان کے بعد امان اللہ خاں کے زمانہ میں افغانستان کی خودمختاری ہے، اور نجات سے مراد بچہ سقا کے فتنہ کا فرو ہونا ہے، ان دونوں مدرسوں کے یہ جدید نام افغانستان کے دو گزشتہ اہم واقعات کی یادگار ہیں۔

ملک افغانستان میں ابتک کوئی متحدہ نظام تعلیم جاری نہیں حبیبیہ، نجات اور استقلال تین طرزوں کی تین مستقل درسگاہیں جن میں اول میں انگریزی، دوم میں جرمنی اور سوم میں فرنچ ذریعہ تعلیم ہے، اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ انگلستان فرنچ اور جرمنی ان تین ملکوں میں سے جس ملک میں جن فنون کی تعلیم بہتر ہوتی ہے، ان کے لئے یہاں انگریزی یا فرنچ یا جرمن کی تعلیم افغان بچوں کو دلاکر بعد کو ان فنون کی اعلی التعلیم کے لئے ان کو انگلستان، فرانس اور جرمنی بھیجا جائے گویا یہاں ان تینوں ملکوں کی ابتدائی تعلیم کے مدرسے ہیں اور اُن کی تکمیل کی اصلی درسگاہیں انگلستان یا فرانس یا جرمنی ہیں۔

اس نظام تعلیم نے ملک میں بیحد ابتری پیدا کر دی ہے، ایک ایک

افغان بچہ کی تعلیم اور یورپ کی آمد رفت اور قیام اور تعلیم پر جو صرف آتا ہے اس سے افغانستان میں ایک چھوٹا موٹا مدرسہ چل سکتا ہے، علاوہ ازیں ملک کے اندر تین مستقل غیر ملکی زبانیں، غیر ملکی معاشرتیں، غیر ملکی سیاستیں اور غیر ملکی ذہنیتیں جڑ پکڑ رہی ہیں، اور جن کا نقصان افغانستان کو آج نہیں تو کل اسی طرح معلوم ہوگا جس طرح ٹرکی کو گزشتہ جنگ عظیم میں معلوم ہو گیا یہی وہ خیالات ہیں جن کی بنا پر شاہ نادر خاں مرحوم کو خود کابل میں ایک افغان یونیورسٹی (دار الفنون کابل) کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مدارس کے بعد موجودہ تمدن کا دوسرا استون مطبع ہے

سرکاری مطبع عمومی۔ دار العلوم سے نکل کر یہاں کے مطبع عمومی کو دیکھنے گیا اگرچہ کابل میں مطبعوں کا رواج امیر شیر علی خاں کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا مگر اخباری و صحافتی حیثیت سے کابل میں اس صیغہ کی تکمیل امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں ہوئی اور سراج الاخبار کے لیے ایک اچھے مطبع کی ضرورت پیش آئی اور لیتھو کی جگہ ٹائپ کو دینی پڑی، امیر امان اللہ خاں کے عہد میں مزید ترقی کے مواقع ملے اور مطبع عمومی کے نام سے ایک وسیع سرکاری مطبع وجود میں آیا، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس پروپگنڈے کے عہد میں افغانستان کے ہر گزشتہ انقلاب میں سلطنت کے دیگر کارخانوں میں جو افراتفری ہوئی ہو مگر اس کارخانۂ اشاعت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہوا امان اللہ خاں کے زمانہ میں یہاں سے

امان افغان نکلتا تھا، بچہ سقا کے فتنہ میں یہاں سے حبیب الاخبار نکلا اور شاہ نادر خاں کے عہد میں اصلاح نکلنے لگا اور جواب تک اسی نام سے نکل رہا ہے"۔

مطبع عمومی ارک شاہی کے قریب بلکہ متصل واقع ہے، سڑک کے رخ دو عمارتیں ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک چوڑی سی گلی ہے موٹر سے سڑک پر اتر کر پہلے ایک عمارت میں داخل ہوا، یہ ایک وسیع ہال تھا جس میں ٹریڈل (پاؤں سے چلائے جانے والے ٹائپ کے پریس) اور دوسری بڑی بڑی مشینیں کام میں مصروف تھیں بجلی کی طاقت سے کام ہو رہا تھا میرا اندازہ ہے کہ آٹھ دس مشینیں کام کر رہی تھیں، یہ تمام مشینیں نہایت عمدہ نہایت صاف اور بالکل جدید طرز کی تھیں، سرکاری اسٹامپ رجسٹروں کے کاغذ، ڈاک کے ٹکٹ اور دوسرے سرکاری کاموں کے علاوہ سرکاری کتابیں انجمن ادبی کے تصنیفات ورسائل اور روزانہ اخبار اصلاح وغیرہ سب اسی مطبع میں چھپتے ہیں۔

اس وقت پریس میں جو کام ہو رہا تھا وہ یہ تھا ایک پریس پر رجسٹر کے اوراق دوسرے پر رسالۂ کابل اور تیسرے پر قرآن پاک چھپ رہا تھا، یہ قرآن پاک حکومت افغانستان کی طرف سے وہاں کی مجلس علماء کے زیر نگرانی نہایت اہتمام سے چھپ رہا ہے اس وقت تک اس کے دو پارے چھپے تھے۔

یہاں سے نکل کر مطبع کی دوسری عمارت میں گیا یہ مطبع کی صناعت نفیسہ کا

شعبہ تھا یہاں زنکوگرافی اور فوٹوگرافی اور فائن آرٹ کی اعلیٰ ترین اور نفیس ترین چھپائی کا کام ہو رہا تھا یہیں ایک کمرہ سیاہ پردوں کے غلاف میں فوٹو لینے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ پھر اس کا بلاک بنانے اور اس کے چھاپنے کے آلات اور پریس تھے۔

یہاں کا عملہ زیادہ تر خود افغان کارکنوں پر مشتمل تھا افسر اعلیٰ صوفی عبدالحمید خاں ہیں جو باوجود نحیف ولاغر جسم ہونے کے اپنے فن میں کامل ہیں طباعت نفیسہ کے شعبہ میں ایک دو جرمن کام کرنے والے بھی نظر آئے زنکوگریفی کے استاد ایک ترک تھے۔

اس پریس میں مجھے تین خصوصیتیں نظر آئیں۔

۱۔ سامان سب اعلیٰ اور عمدہ اور جدید تھا

۲۔ کام کا نمونہ نہایت صاف ستھرا تھا۔

۳۔ پریس اور پریس کے تمام کام کرنے والے بلکہ پریس کی تمام زمین و آسمان سب میں حد درجہ صفائی اور ستھرائی تھی کہیں داغ دھبہ یا زمین پر کوڑا کرکٹ بلکہ ردی کاغذ تک پڑا نظر نہیں آتا تھا

صوفی صاحب نے فرمایا کہ مطبع کے لئے اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے بہت سی نئی مشینیں جرمنی سے منگوائی ہیں جو عنقریب آنے والی ہیں ان کے آجانے کے بعد یہ مطبع قریباً دونا ہو جائے گا۔

اخبارات و رسائل۔ اس مطبع عمومی کی مناسبت سے یہاں کے اخبارات اور رسائل کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے افغانستان میں سب سے

پہلا اخبار امیر شیر علی خاںؒ کے عہد میں سنہ ۱۲۹۰ھ میں شمس النہار کے نام سے ہفتہ وار نکلا تھا، پھر سراج الملۃ والدین امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں سراج الاخبار نکلا لیکن درحقیقت امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں لوگوں کو اخبارات کی طرف توجہ زیادہ ہوئی امان افغان کے نام سے سرکاری اخبار کابل سے نکلنے لگا اور اسی زمانہ میں جنرل نادر خاں نے جلال آباد سے سنہ ۱۳۳۰ھ میں اتحاد مشرقی کے نام سے دوسرا اخبار نکلوایا۔

بہرحال اس وقت یہاں سے جو اخبارات اور رسائل نکل رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اصلاح کابل شاہ نادر خاں بچہ سقا کے فتنہ کے خلاف جب مصروف جہاد تھے تو اس نام سے یہ موقت اخبار اپنے معسکر (کیمپ) سے نکلوایا، کامیابی کے بعد اس کو مستقل طور سے سرکاری اخبار کی حیثیت سے جاری کر دیا یہ اخبار چار بڑے صفحوں میں نسخ ٹائپ میں چھپتا ہے، زبان فارسی ہے اس میں زیادہ تر اخلاقی، ادبی، تجارتی، مذہبی، قومی اور سیاسی مقالات شائع ہوتے ہیں، پھر تمام دنیا کی خبریں اس میں درج ہوتی ہیں پھر مقامی خبریں اور حکومت کے اعلانات اور گزٹ ہوتے ہیں مدیر کا نام برہان الدین کشککی ہے، ملک کے اندر ۳۰ افغانی اور باہر نصف پونڈ قیمت ہے۔

۲۔ انیس۔ کابل یہ اخبار آج سے چھ برس پہلے سنہ ۱۳۰۶ شمسی میں غیر سرکاری یعنی قومی حیثیت سے نکلا تھا اور اب تک نکلتا ہے اور اس کی

حیثیت اب بھی سرکاری کے بجائے قومی ہے اس کے موجودہ اڈیٹر کا نام محمد امین خاں خوگیانی ہے ہفتہ میں ایک دفعہ شائع ہوتا ہے۔

۳۔ اتفاق اسلام، ہرات یہ اخبار سنہ ۱۲۹۹ شمسی میں نکلا تھا، اور اب تک کہ ۱۳۱۳ شمسی ہے یہ نکل رہا ہے ہندوستان کے موجودہ افغان جنرل کونسل صلاح الدین خاں سلجوقی بھی اس کے اڈیٹر رہ چکے ہیں موجودہ اڈیٹر میر محمد عثمان الحسینی ہیں۔

۴۔ بیدار۔ مزار شریف یہ سنہ ۱۳۰۰ شمسی سے نکلتا ہے، قدیم خراسان کا نام آج مزار شریف ہے کہ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار ہونا مشہور ہے اور اس لئے اس کا نام مزار شریف مشہور ہو گیا ہے، یہ روسی ترکستان سے ملحق ہے اس کے موجودہ اڈیٹر کا نام مجاہد ہے۔

۵۔ طلوع افغان، قندھار یہ اخبار بھی سنہ ۱۳۰۰ شمسی سے نکل رہا ہے پہلے اس کی بھی زبان فارسی تھی مگر اب پشتو ہے، اور اس کے موجودہ اڈیٹر عبدالحی خاں ہیں قندھار آجکل پشتو تحریک کا مرکز ہے۔

۶۔ اتحاد۔ خان آباد قطغن اس کی اشاعت بھی سنہ ۱۳۰۰ شمسی سے ہے اور اب تک نکل رہا ہے اس کے موجودہ اعزازی اڈیٹر غلام جیلانی خاں جلالی ہیں۔

ان اخبارات کے علاوہ چند رسالے بھی خاص شہر کابل سے نکل رہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مجلہ کابل۔ یہ انجمن ادبی کا رسالہ ہے اور علمی و ادبی و تاریخی

مضامین پر مشتمل ہیں مہینہ شائع ہوتا ہے اس میں افغانستان کے تمام بڑے بڑے ادباء اور شعراء کے مضامین اور اشعار چھپتے ہیں، غیر زبانوں کے محققانہ مضامین بھی ترجمہ ہو کر اس کے اوراق میں جگہ پاتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تصاویر اور بلاک کے نقشے بھی اس میں ہوتے ہیں یہ تین سال سے نکل رہا ہے، نصف پونڈ قیمت ہے۔

۲۔ آئینۂ عرفان۔ یہ رسالہ گو امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں ۱۳۰۲ شمسی میں نکلا تھا مگر بند ہو گیا تھا، نادر خاں کے زمانہ میں یہ دوبارہ نکلا اور اب تک نکل رہا ہے یہ افغانستان کی وزارت تعلیم کا رسالہ ہے اس میں مدارس و مکاتب کے مدرسین و معلمین اپنے مضامین و تراجم شائع کراتے ہیں، اور مدرسوں کی رودادیں وغیرہ چھپتی ہیں، اڈیٹر کا نام ہاشم خاں شائق ہے، کابل میں نو افغانی صوبوں میں دس افغانی اور ہندوستان میں ساڑھے چار روپیے قیمت ہے۔

۳۔ مجلہ اقتصاد۔ اس رسالہ میں تجارتی، زراعتی، مالیاتی، صنعتی الغرض معاشی مضامین شائع ہوتے ہیں یہ بھی نادر خاں کے عہد حکومت کی یادگار ہے تین سال سے جاری ہے مہینہ میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے محمد زمان ترہ کی اس کے اڈیٹر کا نام ہے اس کی قیمت افغانستان میں چھ افغانی ولایات میں سات افغانی اور باہر ۱۰ شلنگ ہے اس رسالہ کو یہاں کی وزارت تجارت کا نمائندہ سمجھئے۔

۴۔ مجموعہ اردوی افغان۔ یہ افغانستان کا فوجی رسالہ ہے امیر امان اللہ خاں کے

زمانہ میں نکل کر بند ہو گیا تھا، نادر خاں کے زمانے میں دوبارہ نکلا افغانستان کی نظامی یعنی باقاعدہ فوج کے چند نوجوان فوجی افسر اس میں مضامین لکھتے ہیں اڈیٹر کا نام سید اکبر خاں ہے۔

۵۔ مجموعۂ صحیہ۔ یہ افغانستان کے محکمۂ حفظانِ صحت کی طرف سے نکلتا ہے یہ پہلے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں سنہ ۱۳۰۲ شمسی میں نکل کر بند ہو گیا تھا، دوبارہ نادر خاں کے زمانہ میں سنہ ۱۹۳۱ء میں نکلا اور اب تک نکل رہا ہے، رشید لطفی اس کے اڈیٹر کا نام ہے اس کی قیمت کابل میں چھ افغانی ولایات میں آٹھ افغانی اور بیرون ملک میں چار شلنگ ہے۔

۶۔ حی علی الفلاح۔ یہ افغانستان کے محکمۂ دینیات یا مجلس علما، کا نمائندہ ماہوار رسالہ ہے اس میں مذہبی و اخلاقی مضامین نکلتے ہیں اڈیٹر کا نام میر غلام خاں ہے۔

ان تمام رسالوں کی زبان فارسی ہے اور سب مطبع عمومی میں ٹائپ میں چھپتے ہیں۔

کابل سے باہر دو اور رسالے نکلتے ہیں ہرات اور پشتو ہرات فارسی زبان میں شہر ہرات سے نکلتا ہے اور پشتو قندھار سے، یہ قندھار کی انجمن ادبی کا نمائندہ ہے۔

سپہ سالار شاہ محمود خاں کی رخصتانہ ملاقات

مطبع سے دارالامان واپس آیا تھوڑی دیر کے بعد سپہ سالار سردا شاہ محمود خاں وزیر حربیہ ملنے آئے سر راس مسعود صاحب نے کمرہ میں سب

لوگ بیٹھے ادبیات پر گفتگو ہوتی رہی سردار شاہ محمود خاں سے کتاب خیام کا تذکرہ آچکا تھا اور یہ بھی مذکور ہوا تھا کہ اس کا ایک نسخہ میرے ساتھ آیا ہے اس وقت سردار موصوف نے اس کا اشتیاق ظاہر کیا اتفاق سے وہ نسخہ سید راس مسعود صاحب کے مطالعہ میں تھا انھوں نے اس کی بہت تعریف کی اور نسخہ مذکور کی لوح پر یہ لکھ کر کہ "میں اس کتاب کو مولوی سید سلیمان صاحب ندوی سے چرا کر سردار شاہ محمود خاں کے نذر کرتا ہوں" ان کے حوالہ کیا، میں نے اس کے نیچے یہ الفاظ لکھ دئے کہ "میں اپنی محبت و عقیدت کی یادگار کے طور پر یہ ہدیۂ پیش خدمت کرتا ہوں" سردار موصوف نے بڑے شوق سے یہ کتاب لی، تھوڑی دیر کے بعد وہ ہم لوگوں سے ایک ایک کر کے بغل گیر ہوئے اور آخری ملاقات کی رسم ادا کر کے رخصت ہوئے، حق یہ ہے کہ موصوف میں بڑی ہردلعزیزی کی شان ہے اردو بہت اچھی بولتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ایک لائق استاد مولوی نجف علی خاں صاحب برادر ڈاکٹر عبد الغنی صاحب (پنجاب) کے شاگرد ہیں۔

پغمان۔ گزر چکا ہے کہ سردار احمد خاں وزیر دربار کی دعوت پر شام کو ۳ بجے پغمان جانا طے پایا تھا، ڈاکٹر سر اقبال کو اعلیحضرت سے رخصتانہ ملاقات کرنی تھی اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ جا سکے وہ شام کو وزیر خارجیہ سردار فیض محمد خاں کے ساتھ دلکشا گئے اور باقی لوگ یعنی سید راس مسعود، پروفیسر ہادی، بیرسٹر غلام رسول اور سرور خاں گویا، دو موٹروں پر پغمان روانہ ہوئے یہاں پغمان کی وہ حیثیت ہے جو شملہ اور نینی تال کی ہے، یا بمبئی

پونہ کی ہے یہ افغانستان کا شاہی اور عمومی تفرج گاہ اور سیر گاہ ہے یہ کابل سے ۱۵ میل دور اور ایک ہزار فٹ اونچا ہے مگر یہ اونچائی ایسی بتدریج اور رفتہ رفتہ آتی ہے کہ چلنے والے کو اونچائی کا احساس نہیں ہوتا، پھر لطف یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کی سی بلندی نہیں، بلکہ خود زمین مرتفع ہوتی چلی گئی ہے آب وہوا کے لحاظ سے یہ کابل کا بہترین مقام سمجھا جاتا ہے اور غالباً اسی سبب سے کابل اور پغمان کے بیچ میں نادر خاں مرحوم نے خاص اپنی جاگیر کی زمین وقف کرکے وہاں سینی ٹیریم، تربیت خانہ حیوانات اور مدرسہ زراعت قائم کیا ہے

کابل سے پغمان کی طرف آدھی دور تک نئی سڑک ایسی عمدہ ہے جیسی ہندوستان کے بڑے شہروں میں سول لائنس کی ٹھنڈی سڑکیں ہوتی ہیں اور دوسری آدھی سڑک بھی خاصی ہے تاہم اصلاح طلب ہے کابل کے حدود سے نکلنے کے ساتھ ہی عجیب کیف انگیز مناظر گزرنے لگے سڑک کے دونوں طرف چنار کے زرد درخت اور کہیں آلو بالو کے سرخ پھولوں والے درخت کہیں اخروٹ کے درخت جابجا چشمے اور آبجو، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، فضا میں زرد اور سرخ پھولوں اور پتوں کی چادریں پھیلی نظر آتی تھیں۔ یہ یہاں خزاں کا مہینہ تھا جس کی یہ خزاں ہے اس کی بہار کیسی ہوگی۔ ع قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

راستے میں سینی ٹیریم، تربیت خانہ، حیوانات اور مدرسہ زراعت کی عمارتیں گذریں۔ واپسی میں ان کے دیکھنے کا خیال تھا اس لئے آگے بڑھ گئے پغمان جیسے جیسے قریب آتا جاتا تھا فضا کی رنگینی ہوا کی برودت اور درختوں کی

بہار بڑھتی جاتی تھی سب سے پہلے پغمان کا صدر دروازہ یا پھاٹک ملا، جو بجائے خود ایک چھوٹی سی عمارت تھی اس کے بعد شاہی قیام گاہ کی عمارت آئی پھر باغ عمومی (پبلک گارڈن) آیا جو پبلک کی سیر و تفریح کا مقام ہے بالآخر پغمان کی سب سے مرتفع سطح پر ہم پہنچ گئے جو اس بہشت زار کی فردوس بریں ہے یہاں دو منزلہ مختصر لیکن بلند عمارت ہے سردار احمد خاں وزیر دربار یہیں مقیم تھے وہ نیچے اتر کر آئے اور مہمانوں کو اوپر کی منزل پر لے گئے اور ایک ایسے کمرہ میں بٹھایا جس میں ہر طرف شیشے لگے تھے اور اس لحاظ سے اس کو شیش محل کہنا چاہیے اس وقت موسم سرد تھا اور ابر بھی تھا اس لئے شیشے کے یہ سب دروازے بند تھے مگر یہاں بیٹھنے والوں کی مشتاق نگاہیں شیشوں کو پار کر کے جہاں تک پہنچ سکتی تھیں فضا کی بلندی میں سیدھے اور راست قامت درختوں کے جھنڈ اور زرد اور سرخ پھولوں کے درختوں کی قطاریں اور زمین کی سطح پر رنگ برنگ پھولوں کی خوش آیند مرتب ہندسی شکلیں آنکھوں کو پر نور اور دلوں کو مسرور کر رہی تھیں، پروفیسر ہادی نے ایران کی سیاحت کی ہے وہ کہتے تھے کہ یہ بالکل ایران کا منظر ہے جنھوں نے کشمیر دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ خاص یہ مقام کشمیر سے زیادہ دلپذیر ہے۔

اسی شیش محل کمرہ میں خوش سلیقہ میزبان نے چائے کی دعوت کا سامان کیا تھا میز پر مختلف قسم کے بسکٹوں اور مٹھائیوں کے علاوہ کابل کے اچھے سے اچھے میوے تھے مختلف رنگ کے انگوروں اور میووں کو خوبصورت ظروف میں مناسب رنگ کے پتوں اور پھولوں سے اس طرح مزین کر کے

رکھا گیا تھا کہ میز لذّتِ کام و دہن ہونے کے علاوہ فردوس نظر بھی معلوم ہوتی تھی۔

لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق چائے اور کافی پی سید راس مسعود صاحب نے کشمیری چائے کی فرمایش کی تھی وہ بھی بن کر آئی گو رنگ تو کشمیری چائے کا ضرور تھا مگر مزہ ہمارے ہندوستان کے کشمیری بھائیوں کی چائے سے کم تھا، افغانستان میں چائے کی پیالی کئی پیالیاں پی جاتی ہیں، مگر صرف پہلی پیالی میٹھی ہوتی ہے، باقی تلخ مگر یہ "تلخوش" تو مجھ "صوفی" کو "ام الخبائث" ہی معلوم ہوئی،

میز پر زیادہ تر یورپ کے مختلف شہروں کے مناظر پہ گفتگو ہوتی رہی سردار احمد خاں مدت تک یورپ رہے تھے اور اکثر شہروں میں کئی کئی مہینے جا کر ٹھہرے تھے۔ سید راس مسعود اور سردار موصوف انھیں شہروں اور وہاں کے مختلف ہوٹلوں پر اظہار رائے فرماتے رہے۔

چائے سے فارغ ہو کر سب لوگ نیچے اترے کابل سے ایک فوٹو گرافر بلوایا گیا تھا وہ نیچے موجود تھا وزیر ممدوح نے پہلے سب کا ایک گروپ باغ کی ایک اونچی سیڑھی پر لیا اسی کے سامنے انسانی ہاتھوں کی کاریگری سے چند اوپر نیچے پتھروں سے قدرتی چٹانوں کی نقل بنی ہوئی تھی حاضرین میں سے ہر ایک الگ الگ ان پتھروں پر بے ترتیب بیٹھ گیا اور اس بے تکلف فطری نشست کی پھر مصنوعی نقل اتاری گئی اس شاہی باغ سے نکل کر اب ہم لوگ باغ عمومی کی طرف چلے، پیدل چلنے میں محسوس ہو رہا تھا کہ اب بلندی سے

ہم نشیب میں اُتر رہے ہیں تھوڑی دیر چل کر وہ باغ آگیا اس باغ کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا، اللہ اکبر کیا باغ تھا گزشتہ زمانہ کی تو خبر نہیں لیکن آج بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس سلیقہ کا باغ تیموریوں نے شاید ہندستان میں بھی نہیں لگایا ہوگا، درختوں کو چھوڑ کے یہ پر لطف مناظر کشمیر کے سوا ہندوستان میں وہ کہاں سے لا سکتے تھے یہ خزاں کا موسم تھا، سرخی کے بجائے پتوں میں زردی چھائی تھی سرو و چنار کے درخت اور قسم قسم کے پھولوں کی بہار اور ان کی ترکیب و ترتیب کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔ پہاڑیوں پر سے ہر طرف قدرتی چشمے بہہ رہے تھے باغ کے بیچ میں ایک قطار میں پانچ فوّارے چھوٹ رہے تھے جن کا پانی بلا مبالغہ پچاس ساٹھ فیٹ اوپر چھوٹ رہا تھا، اور وہاں سے ہلکی ہلکی پھواریں بن کر فرش زمین پہ گر رہا تھا۔

یہاں بھی ان پانچوں فواروں کی طرف پشت کر کے (بیک گراؤنڈ) ایک مرقع لیا گیا۔

دریائے کابل - یہاں سے نکل کر دریائے کابل کی طرف چلے باغ کے بعد سڑک تھی اور سڑک کے بعد کچھ ہٹ کر کابل کا "نازنین" دریا بہہ رہا تھا دریائے کابل کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ہم ہندوستانیوں کو جو گنگا اور جمنا کے دیکھنے کے عادی ہیں اس کو دریا کہنے اور ماننے میں بہت کچھ تامل ہوگا یہ دریا یہاں جہاں سے ہم کو نظر آیا اس کا عرض کہیں دو تین گز سے زیادہ نہیں دیکھا باایں ہمہ اس کے طول کا یہ عالم ہے کہ یہ کابل سے چل کر ہندوستان کے دریائے سندھ میں آکر

گرتا ہے جاڑوں میں اس میں برف جمتی ہے اور پھر پورے سال بھر اس کی روانی قائم رہتی ہے سنا ہے کہ جاڑوں کے زمانہ میں افغان آتے ہیں، اور لات مار کر برف کو توڑ ڈالتے ہیں اور نیچے کے ٹھنڈے پانی سے نہ صرف وضو بلکہ غسل بھی کرتے ہیں ہندوستان کے لوگوں کو تو اس تصور سے بھی سردی معلوم ہونے لگے گی دریا کے نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف پتھر کی سلیں پڑی ہیں اور انھیں پر سے "پھسلتا ہوا اور اٹکتا ہوا" یہ بہتا رہتا ہے اس دریا پر آنے کی غرض بھی فوٹو لینا تھی، مگر دریا کے نیچے ہونے کی وجہ سے دریا کی روانی کے ساتھ مرقع نہیں کھینچ سکا بالآخر دریا کو پیچھے کر کے سڑک پر کھڑے ہو کر چوتھا گروپ لیا گیا۔

اس کے بعد ہم لوگ موٹروں پر بیٹھ کر کابل کی طرف روانہ ہوئے خیال تھا کہ راستہ میں سینی ٹیریم وغیرہ دیکھیں گے مگر واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ ان عمارات کو دور سے دیکھنے کے سوا اتر کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر بیرسٹر غلام رسول خاں ان کو دیکھ چکے تھے ان سے سن کر اور دوسرے احباب کابل سے جو کچھ معلوم ہوا وہ سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

دار الصحت یا سینی ٹیریم۔ اخیر جنگ انگریز و افغان کے کامیاب نتیجہ کے بعد امیر امان اللہ خاں نے جنرل نادر خاں سپہ سالار کو ان کے حسن خدمات کے صلہ میں کابل و پغمان کے بیچ میں ایک زمین جاگیر میں دی تھی جس کا نام علی آباد ہے نادر خاں نے اپنے زمانے میں باتفاق اطبا دار الصحت (سینی ٹیریم) کے لئے موزوں سمجھ کر اس میں دق و سل کے مریضوں کے لئے اقامت گاہ بنوایا اس دار الصحت

کی عمارت اور دیگر مصارف کے لئے بھی شاہ نادر خاں نے اپنی جیب سے روپیہ دیا۔

عمارت سہ منزلہ ہے ساٹھ مریضوں کے رہنے کے لئے اس میں کمرے بستر اور راحت کے دوسرے سامان ہیں، سامنے عمدہ باغ خوبصورت روشیں، چمن زار اور سڑکیں ہیں۔

تربیت خانہ حیوانات ۔ اسی کے قریب اسی راہ پر حیوانات کی پرورش اور ان کی عمدہ نسل لینے کا محکمہ ہے جس کا نام "دائرہ تربیت حیوانات ونسل گیری" ہے، اس دائرہ کے افسر اعلیٰ کا نام محمد یوسف خاں ہے، ہمارے رفیق غلام رسول خاں جنھوں نے اس کو دیکھا تھا اس کی بڑی تعریف مجھ سے کی یہاں جانوروں کی علمی اور سائنٹفک طریق سے بہترین پرورش اور علاج کا سامان ہے اور عمدہ نروں کے ذریعہ سے اچھی اور قوی بچوں کی نسل لینے کا پورا اہتمام ہے۔

بعض احباب کی ملاقات ۔ پغمان سے سیدھے دارالامان کو واپسی ہوئی بعض احباب ملاقات کو آئے مولوی بشیر صاحب صدر جمعیت مجاہدین چمرقند، مولنا محمد میاں صاحب (المعروف بہ منصور) یہ مولنا عبداللہ صاحب انصاری مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کے خلف الرشید اور مولنا محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند کے نواسہ ہیں اور ایک افغان عالم تھے جو حضرت شیخ الہند رحم کے شاگرد تھے ان صاحب نے مولنا حسین احمد صاحب اور مولنا کفایت اللہ صاحب تک سلام پہنچانے کی خدمت میرے سپرد کی تھی جس سے بحمد اللہ کہ میں عہدہ برآ ہو گیا اُن کے ساتھ اخبار انیس کابل کے اڈیٹر محمد امین خاں خوگیانی بھی تھے تھوڑی دیر کے بعد منشی میر شمس الدین مرحوم سابق ناظم حمایت اسلام لاہور

(جو افسوس کہ اس مہینہ وفات پا گئے) کے صاحبزادہ میر رحمت اللہ ہمایون اور مقبول الحق یہاں کے سرکاری کارخانہ گوگرد (دیا سلائی) کے مہتمم آئے۔

کل صبح کابل سے غزنین کو روانگی ہے، اس لئے احباب رخصت کرنے کے لئے آ رہے ہیں۔

احباب کے رخصت ہونے کے بعد میں نے اور میرے ملازم نے مل کر کل صبح کی روانگی کے لئے سامانِ سفر درست کیا اور اس سے فارغ ہو کر نماز کے بعد کابل کی آخری شب بسر کرنے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا۔

غزنین کا سفر

تیس اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء کی صبح کو جب بیدار ہوا تو اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ آج اس ''غزنین'' کو دیکھوں گا جس کا نام قلم سے سینکڑوں دفعہ لکھا، زبان سے ہزاروں دفعہ لیا، اور آنکھوں سے لاکھوں دفعہ پڑھا، غزنین سلطان محمود کا غزنی جس کا نام کبھی دنیا میں رعب و ہیبت بٹھاتا تھا جس کے آستانہ پر اربابِ کمال کا ہجوم رہتا تھا جس نے صدیوں دنیائے اسلام کی رہنمائی اور ہندوستان پر فرمانروائی کی عنصری، فرخی، فردوسی اور سنائی کا غزنین جس نے ہمارے ادبیات کی دنیا میں غیرفانی شہرت حاصل کی اور جس کی سیاسی تاریخ مورخین عالم کی تحقیقات کا مدت سے موضوع بحث ہے صبح اٹھ کر ضروریات سے فراغت کی بندھے ہوئے

اسباب کو دیکھا بھالا رخصت کرنے والے احباب سے بار بار مصافحے ہوئے اور چند روز کے اس قیام کی یاد کے وعدے ہوئے۔

خدام کو انعام ۔ عموماً دستور ہے اور یورپ میں تو یہ دستور قانون کی حد تک ہے کہ جب ہوٹل سے نکلئے یا کسی اقامت گاہ میں پہنچئے تو پہلے خدام کو ٹپ (بخشش) دیجئے حتیٰ کہ چائے خانے اور ریسٹوران میں بھی اس "اخلاقی قانون" کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی، یہی چیز ٹرکی میں "بخشیش" کہلاتی ہے یورپ والے جب پرانی ٹرکی کا سفر کرتے تھے تو اس بخشیش کے مطالبہ کو بہت برے اور ذلیل رنگ میں پیش کرتے تھے لیکن اُن کو اپنے ملک کا "ٹپ" برا نہیں معلوم ہوتا اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ "بخشیش" مشرقی مسکنت اور نرمی کے لہجہ میں مانگی جاتی ہے، اور درازی عمر وغیرہ کی مسلسل دعاؤں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے، اور "ٹپ" یورپین خشکی کے ساتھ وصول کی جاتی ہے، اور سر کو ذرا سی جنبش دے کر اور "تھینک یو" کہکر اس کی قیمت فوراً ادا کر دی جاتی ہے۔

ہندی مہمانوں نے طے کیا تھا کہ اس سرکاری مہمانخانہ کے خدام کو جنھوں نے ہماری مہمانی کے فرائض متعلقہ بہت خوبی سے انجام دئے تھے سو روپیے انعام میں دئے جائیں لیکن چلتے وقت جب یہ رقم ان کو برضائے تام، دی جانے لگی تو انھوں نے بہت خوشی سے اس انعام کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ انھوں نے اپنے مہمانوں کا واجب فرض انجام دیا ہے جس کے لئے وہ کسی انعام کے مستحق نہیں ہیں ان کے اس فیصلہ سے بڑا تعجب ہوا، اور ان کی اخلاقی بڑائی کا سکہ مہمانوں کے دلوں پر بیٹھا۔

یہ خدام نہایت ہوشیار، نہایت باادب اور باسلیقہ اور خاموش تھے اتنے دنوں میں ایک دفعہ بھی اُن کے شور و غل کی کوئی آواز کانوں میں نہیں آئی جائے، کھانا، بستروں کی درستی اور کمروں کی صفائی وغیرہ کے تمام کام وہ نہایت خوبی اور خاموشی کے ساتھ انجام دیتے تھے ان کی وضع یہ تھی سیاہ پینٹ، سیاہ کوٹ، سپید قمیض، پاؤں میں بوٹ اور سروں پر بالوں کی افغانی ٹوپیاں۔

کابل سے روانگی ۔ حکومت نے اپنے مہمانوں کے آرام سفر کا اہتمام بڑی خوبی سے کیا، یہ بیان شاید پہلے گزر چکا ہے کہ کل مملکت افغانستان میں سفر کی پرانی منزلیں دس بارہ میل پر ہوتی تھیں ہر منزل پر حکومت کی طرف سے ڈاک بنگلے یا سرکاری اقامت خانے بنے ہوئے ہیں جس میں قیام کے ہر قسم کے سامان و اسباب مہیا ہوتے ہیں اب موٹروں کی تیز رفتاری نے اس منزل کو دور تر کر دیا، اب یہ بنگلے اسّی اور سو میل کے بعد آتے ہیں۔

حکومت نے مہمانوں کے قیام و انتظام کے لئے متوقع قیامگاہوں میں اطلاعی احکام بھیجدیئے تھے اور نگران کار اور میزبان کی حیثیت سے سرور خاں گویا کو متعین کیا تھا کہ وہ مہمانوں کے ساتھ حکومت افغانستان کی آخری سرحد تک جائیں اور وہاں سے پہنچا کر واپس آئیں۔

سواری اور بار برداری کے لئے حکومت نے دو عمدہ موٹروں اور دو لاریوں کا انتظام کیا تھا ایک موٹر پر خاکسار، ڈاکٹر اقبال اور بیرسٹر غلام رسول اور دوسرے پر سر راس مسعود پروفیسر ہادی، جناب سرور خاں گویا اور عبدالمجید صاحب

نمائندہ سفارت خانہ افغانستان، دہلی سوار ہوئے ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے والے اور کھلانے والے ملازمین کے لئے تھی اور دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان و اسباب تھا ساتھ ہی حکومت نے مہمانوں کے فوجی اعزاز اور حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا ایک دستہ ساتھ کردیا تھا، وہ بھی انھیں لاریوں پر سوار تھے اس دستہ کا افسر جس کو غند مشر کہتے ہیں جو جلال آباد کے پاس گرونیز کے سادات میں سے تھا (نام بھول گیا) افسر مذکور بھی ہمارے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ پر شوفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ہم لوگوں کی روانگی میں ملنے ملانے کے باعث کچھ تاخیر ہو رہی تھی اس لئے لاریوں کو آگے روانہ کردیا گیا، آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ بھی روانہ ہوگئے۔

کابل سے غزنین تک۔ کابل سے غزنین ۸۲ میل ہے موٹریں دشت وجبل اور نشیب و فراز کو لمحہ بہ لمحہ طے کرتی ہوئی اور خاک اڑاتی ہوئی رواں تھیں راستہ بہت حد تک صاف تھا سڑکیں عموماً اچھی حالت میں تھیں زمین زیادہ تر ہموار تھی دور دور پہاڑ بھی نظر آتے تھے اور اُن کے دامنوں میں وسیع میدان اور وادیاں پھیلی تھیں، ان وادیوں میں پہاڑی چشمے بہہ رہے تھے جن کے سبب سے یہ وادیاں موسم بہار میں سرسبز ہوجاتی ہیں اور کاشت کے کام میں آتی ہیں یہ تمام زمین قابل زراعت تھی اور خوشی کی بات ہے کہ افغان کاشتکار اس میں پوری محنت سے کھیتی کرتے ہیں کابل سے لیکر غزنین تک کھیتوں کا سلسلہ برابر ملتا چلا گیا مگر اس وقت کسی کھیت میں بھی کوئی چیز بوئی ہوئی نہ تھی یہاں کی کاشت کا زمانہ گرمیوں میں آتا ہے جب برف پگھل کر زمین کو شاداب کرتی ہے۔

یہاں گاؤں کی آبادیوں کا اصول یہ ہے کہ یہ چشمے جدھر جدھر مڑتے ہوئے بہتے ہیں انھیں کے قریب تھوڑی تھوڑی دور پر گاؤں آباد ہوتے ہیں پھر قدرتی اسباب سے جب یہ چشمے بھی خشک یا بند ہو جاتے ہیں تو یہ گاؤں بھی مٹ جاتے ہیں اور دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں کہیں ایسا نظر آیا کہ چشمہ نے گاؤں کی ایک سمت سے دوسری سمت کو رخ کر لیا تو گاؤں کی آبادی نے بھی اِدھر سے اپنے جھونپڑے اُٹھا کر اُدھر ڈال دئے دیواریں مٹی کی اور چھتیں بھی عموماً مٹی کی ہوتی ہیں اور بارش کی کمی کے سبب سے یہ چھتیں یہاں مستحکم رہتی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا غیر منقطع سلسلہ نظر کے سامنے تھا ان پہاڑیوں کے سبب سے کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگے راستہ بند ہے اور ان پہاڑیوں پر چڑھ کر جانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے راستہ وادیوں میں گھوم گھوم کر بہت صاف نکلتا آتا تھا۔

پشاور اور کابل کے درمیاں جو خوفناک پہاڑی راستہ ہے اُس کے بالمقابل ہم اس راستہ کو نہایت صاف میدانی راستہ کہہ سکتے ہیں کہیں کہیں بیچ میں نشیب تھا اور اس کی دونوں طرف کی زمینیں بلند تھیں ایسے موقعوں پر عموماً پل بندھے تھے لیکن ایسے مقامات بھی آئے جہاں پل سرے سے نہ تھے یا ٹوٹ گئے تھے بظاہر مشکل نظر آتا تھا کہ اس اتار چڑھاؤ کو موٹریں کیسے طے کر سکیں گی ان افغانی شوفروں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس آسانی سے موٹروں کو اتار اور چڑھا لیتے تھے کہ ہم کو ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔

راستہ میں ایک دو پہاڑیاں ایسی بھی آئیں جن کے اوپر ہمارے رفیق فوجی

افسر نے بتایا کہ افغانی قلعے ہیں، اور ان میں سرکاری فوج رہتی ہے۔

راہ میں لاریاں مل رہی تھیں جن پر تجارتی سامان آجا رہا تھا، پرانے قافلے کے اونٹ اور گدھے بھی بوجھ سے لدے ہوئے آجا رہے تھے خانہ بدوش قبیلے اور خاندان جن میں عورت مرد اور بچے سب تھے پا پیادہ اور گدھوں پر سوار ملتے جاتے تھے ان کے ساتھ ساتھ ان کے رفیق کتے بھی ہوتے تھے کبھی کبھی گدھوں کے اوپر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں جو عجب دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔

اب دوپہر کا وقت تھا مگر دھوپ میں حدت نام کو نہ تھی بلکہ کافی سردی تھی سردی کے پورے لباس پہننے کے باوجود موٹر کی شیشے کی کھڑکیاں اٹھائی تھیں کہ ہوا اور غبار سے حفاظت رہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہم کو راستہ بھر کوئی پرندہ نظر نہیں آیا، شاید یہ سبب ہو کہ اس ملک میں یہ کاشت کا زمانہ نہ تھا اور میدان غلہ سے خالی تھا۔

غزنین۔ ایک بجے دن کے قریب غزنین کا سواد نظر آیا مشتاق نگاہیں اوپر کو اٹھ رہی تھیں مگر ہر بار ناکام واپس آجاتی تھیں، ہمارے خیال میں پرانی دہلی کے کھنڈر کے مناظر تھے، اور ہم سمجھے تھے کہ ہم کو قلعہ، مسجدوں اور عمارتوں کے منار اور گنبد دور سے نظر آئیں گے لیکن ہماری مشتاق نگاہوں کے استقبال کے لئے اس قسم کی کوئی چیز ادھر سے نہیں آرہی تھی؛

موٹریں رفتہ رفتہ اپنی چال سست کر رہی تھیں یہاں تک کہ آبادی کا سواد سامنے آگیا شہر پناہ سے باہر ایک بلندی پر سرکاری مہمان خانہ کی عمارت تھی موٹریں اس کے احاطہ میں داخل ہو کر اس کے بڑے دروازہ کے سامنے

جا کر رکیں اور ہم لوگ غباروں میں لٹے ہوئے موٹروں سے باہر نکلے استقبال کیلئے حکومت کی طرف سے قوماندان (یہاں کی فوج اور پولیس کا افسر اعلیٰ) اور شہر کی طرف سے رئیس بلدیہ (میونسپلٹی کا چیرمین) موجود تھے، ان دونوں نے ہم کو خوش آمدید کہا اور خواہش کی کہ ہم پہلے شہر کے بازار میں ایک چکر لگالیں عمارت مذکور کے پائین میں ایک خیابان تھا اس سے نیچے اتر کر سڑک پر آئے، اب ایک راستہ تو بازار کی پشت پر سے لنبائی میں اخیر تک جاتا تھا اور دوسرا راستہ پھر بلندی پر چڑھ کر بازار کے عین وسط سے گزرتا تھا یہیں پر بازار سے پہلے ہی برسر راہ ایک کچی مسجد تھی اور نشیب والی سڑک کے برابر برابر مسجد کے نیچے ایک نہر بہہ رہی تھی۔

بازار ۔ ہم نچلی سڑک سے اوپر مسجد کے پاس سے اوپر چڑھ کر بازار میں داخل ہوئے آگے آگے قوماندان صاحب ان کے پیچھے رئیس صاحب بلدیہ پھر مہمان سب سے پیچھے ہمارے ساتھ کے سپاہی بازار سے گذرے دکانیں سب کھلی تھیں چھوٹی چھوٹی معمولی دکانیں تھیں بعض دکانوں پر چھینٹ کی قسم کے ادنیٰ کپڑے بک رہے تھے زیادہ تر دکانیں پوستینوں کی تھیں چھوٹی پوستینیں جن کو شلوکہ کہتے ہیں پندرہ روپیہ کو اور بڑی میں پچیس کو بکتی تھیں، بالائی حصہ زرد رنگ کا تھا آستینوں پہ اور گلے پر ریشمی تاگے کا کام بنا تھا۔

ہم جس دکان کے سامنے گزرتے دکاندار کھڑے ہوجاتے اور السلام علیکم کہنے کے بعد "ماندہ نباشی" (تھکے نہ ہوں) کہتے یہ یہاں مہمانوں کے لئے خیر مقدم کے الفاظ ہیں، دکانداروں میں ہم نے تعجب کیساتھ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی دیکھا جن کے سروں پر زرد پگڑیاں بندھی تھیں معلوم نہیں یہ کب سے یہاں آباد ہیں۔

اردو گراموفون ۔ بازار دو فرلانگ کے قریب لمبا تھا اوپر سے پرانے شہروں کے بازاروں کی طرح یہ بھی مسقف تھا بازار کو ایک سرے سے دوسرے تک ختم کر کے اسکی پشت کی سڑک سے ہم واپس آئے ادھر بھی بازار مذکور کی پشت سے لگی ہوئی صرف ایک سمت میں دکانیں تھیں درمیان راہ میں ایک دکان سے گراموفون کے بجنے کی آواز آرہی تھی غور جو کیا تو ریکاڈ کا گانا تمامتر اردو تھا کابل میں تو اردو زبانِ ثانی کی حیثیت رکھتی ہے اور ہندوستانیوں کی کثرت کی وجہ سے اس پر تعجب نہیں ہوسکتا لیکن غزنین میں جہاں شاید ہی کوئی ہندوستانی ہو اردو کی اس جہانگیری پر تعجب ہوا۔

مسجد ۔ اس دوسری سڑک پر سے چل کر ہم اس مسجد تک پہنچ گئے جس کا تذکرہ ہلے کیاہے ظہر کا وقت ہوچکا تھا چاہا کہ اس مسجد میں جاکر نماز ظہر ادا کروں مسجد ندی پر تھی اوپر زینہ سے چڑھکر مسجد میں داخل ہوا ظہر کی جماعت ہو رہی تھی مگر دیکھکر تعجب ہوا کہ وہاں وضو کا کوئی سامان نہ تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا نیچے سڑک کے کنارے نہر بہہ رہی ہے وہی گویا مسجد کا حوض ہے اور سی لئے یہاں کسی دوسرے سامان کی ضرورت نہ تھی ناچار یوں ہی مسجد سے واپس آگیا

یہ مسجد مٹی کی خام بنی ہوئی تھی دیواریں بھی کچی تھیں اور چھت اور فرش بھی

سرکاری مہمانخانہ ۔ غزنین کا سرکاری مہمانخانہ شہر سے الگ ایک بلندی پر واقع ہے عمارت خاصی ہے کمرے وسیع ہیں ہر کمرہ اوسط درجے کے فرنیچر سے آراستہ ہے یک لمبا ہال ملاقات اور کھانے کے کمرہ کے لئے ہے چند کمرے مہمانوں کے سونے ور آرام کرنے کے لئے ہیں کمروں میں فرش مسہریاں، بستر، پردے سب باقاعدہ لگے تھے

واپس آکر کھانا کھایا گیا چائے پی گئی مہمانی کے فرائض رئیس صاحب بلدیہ بہت خوبی اور اخلاق سے ادا کر رہے تھے کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد کچھ دیر ہم نے آرام کیا پھر غزنین کے مزارات اور بقیہ عمارات کے دیکھنے کی تیاری کی گئی چار بجے کے قریب ہم شہر کی زیارت کو نکلے۔

پرانا غزنین۔ ہم غزنین کو اپنی کہنہ و فرسودہ دلّی کی طرح آباد سمجھتے تھے اور یہ خیال تھا کہ مرمٹنے کے بعد یہ زندہ ہوگا مگر یہ دیکھ کر اور سن کر کس قدر افسوس ہوا کہ صدیوں سے پرانے غزنین کا نام و نشان بھی باقی نہیں، تاریخوں میں یہ پڑھا تھا کہ غزنویوں کے اخیر دور میں علاء الدین غوری نے غزنین کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا اور اسی لئے اس کا نام "جہان سوز" پڑ گیا تھا، مگر اس سے یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایسا برباد کر دیا گیا تھا کہ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی تھی۔

علاء الدین جہانسوز۔ چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں غزنویوں کا زوال اور غوریوں کے اقتدار کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس خاندان کی چھٹی پشت پر عباس نامی ایک دلیر سفاک بہادر پیدا ہ جس نے اس خاندان کی بنیاد رکھی اور اس کی نویں پشت پر ملک عزالدین حسین ہ جس نے غور کے کوہستان میں ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی اس کے سا نامور بیٹے ہوئے ان میں سے ایک کا نام قطب الدین محمد دوسرے کا نام سیف الدی سوری اور تیسرے کا نام علاء الدین حسین تھا قطب الدین محمد کا لقب ملک الجبال تھا یہ قطب الدین اپنے بھائیوں سے خفا ہو کر غزنین چلا آیا اور اپنی داد و دہش ا حسن سیرت و صورت کی بنا پر یہاں بہت ہر دلعزیز ہو گیا یہ بہرام شاہ غزنوی

(۵۱۱ھ تا ۵۴۷ھ) کا زمانہ تھا سلطان نے حاسدوں کے کہنے سننے سے قطب الدین سے بدگمان ہوکر اس کو قتل کرادیا، علاء الدین حسین نے بھائی کے انتقام کی خاطر غزنین پر حملہ کیا اور فتح کرلیا بہرام شاہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا علاء الدین اپنے چھوٹے بھائی سیف الدین سوری کو غزنین کے تخت پر بٹھاکر غور واپس چلا گیا بہرام شاہ نے موقع پاکر پھر غزنین پر قبضہ کرلیا، اور سیف الدین کو گرفتار کرکے بڑی ذلت سے مروا ڈالا، علاء الدین نے جو یہ سنا تو غصہ سے آگ بگولا ہوگیا اور ایک لشکر جرار لے کر غزنین پہنچا، بہرام شاہ اس اثنا میں ۵۴۷ھ میں وفات پاگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا خسرو شاہ بیٹھا وہ غوری لشکر کی تاب نہ لاسکا اور بھاگ کر لاہور چلا گیا علاء الدین نے غزنین پر قبضہ کرکے قتل عام کا حکم دیدیا اور شہر میں آگ لگادی سات روز تک متصل شہر جلتا رہا، سلطان محمود سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم کے سوا تمام سلاطین غزنوی کی قبریں تک اکھاڑ کر ان کی ہڈیاں آگ میں جلائیں مورخین کا بیان ہے

> علاء الدین بقہر شہر غزنین بگرفت و ہفت شباں روز غزنین را آتش زد و بسوخت و مکابرہ فرمود راوی چنیں میگوید کہ دریں ہفت شباں روز از کثرت سواد دود چناں ہوا مظلم بود کہ شب را مانستی و شب از شعلہائے آتش کہ شہر غزنین می سوخت، ہوا چناں روشن می بود کہ بروز مانستے و دریں ہفت شباں روز دست کشاد و غارت و کشتن و مکابرہ بود و ہر کرا از مرداں یافتند بکشتند و عورات و اطفال را اسیر کردند و فرمان داد تا کل سلاطین محمودی را از خاک برآوردند و بسوختند مگر سلطان محمود و سلطان مسعود و سلطان ابراہیم را..... چوں ہفت روز درگذشت و شب ہشتم شد و شہر تمام خراب و سوختہ و خلق کشتہ و جدا گشت ”

علاء الدین تیغ زن کے ساتھ سخنور بھی تھا اس نے اس جشن مسرت میں اپنے فخر میں ایک نظم کہی اور ایک طرف جب شہر میں قتل عام ہو رہا تھا اور عمارتیں جل کر خاک ہو رہی تھیں غور کا یہ نیرو مجلس عشرت میں بیٹھا قوالوں کی زبان سے اپنا وہ فخریہ سن رہا تھا۔

جہاں داند کہ من شاہ جہانم   چراغ دودۂ عباسیانم[۱]
علاء الدین حسین بن حسینم   کہ دائم باد ملک خاندانم
چو بر گلگون دولت بر نشینم   یکے باشد زمین و آسمانم
ہمہ عالم بگردم چوں سکندر   بہر شہرے شہ دیگر نشانم
بر آں بودم کہ از اوباش غزنین   چو رود نیل جوے خوں برانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں   شفاعت میکنند بخت جوانم
ببخشیدم بدیشاں جان ایشاں   کہ با واجان شان پیوند جانم

دنیا نے اس علاء الدین کو اس کی اس سنگدلی کا یہ بدلہ دیا کہ زبان خلق سے اس کو جہان سوز کا لقب دلوایا جو آج تک اس کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

پرانے غزنین کی تباہی و بربادی کی یہ مختصر داستان ہے جو ۵۴۴ھ اور ۵۴۵ھ میں وقوع پذیر ہوئی۔

نیا غزنین۔ پرانا غزنین غوریوں کے پورے ایام حکومت میں پھر تاتاریوں اور تیموریوں کے زمانہ میں بھی اسی طرح بے نام و نشان رہا معمولی سی آبادی جو باقی رہ گئی تھی کہتے ہیں کہ ایک سال کی سخت برف باری میں وہ بھی مٹ گئی، عبدالکریم علوی نے

---

[۱] عباس غوری کی طرف اشارہ ہے۔

تاریخ احمد شاہ درانی میں (جو زیادہ تر امام الدین حسینی کی تاریخ سے جو ۱۲۱۲ھ میں لکھی گئی تھی ماخوذ ہے) غزنین کے حال میں لکھا ہے۔

> از قلعہ شش گاؤ بہ بلدۂ غزنین می رسند و آن سابق مکان تخت نشین سلطان محمود غزنوی
> بود در زمانِ ماضی آبادی بسیار داشت، یکبار بر ایں چنداں برف بارید کہ تمام شہر
> زیر آں خراب شد، بجز چند کس زندہ نماند از آں زمان آں شہر آباد نشد الحال مردم
> تاجیک و افغان اندرون قلعہ قریب دو سہ ہزار خانہ آباد اند۔" (ص۵۴)

موجودہ شہر غزنین احمد شاہ ابدالی کے جانشین تیمور شاہ المتوفی ۱۲۰۷ھ کی تعمیر ہے مٹی کا ایک بلند حصار ہے جس کے اندر موجودہ شہر آباد ہے حکومت افغانستان میں اس کی حیثیت اول درجہ کے شہروں میں نہیں اور نہ یہاں گورنر رہتا ہے جس وادی میں یہ شہر آباد ہے بہت بڑی وسیع وادی ہے جس میں یقیناً بہت بڑا شہر آباد ہو سکتا ہے اور مختلف صوبوں کے درمیان اس کی جائے وقوع تجارتی حیثیت سے اس کو تھوڑی توجہ سے بہت بلند کر سکتی ہے۔

ملا قربان۔ غزنین کے کونوں، گوشوں، ڈھیروں اور قبروں کے واقف کار ملا قربان نامی ایک پیر فرتوت بزرگ ہیں مقامات کے دیکھنے کے لئے نکلنے سے پہلے سرور خان نے ملا قربان کو یاد کیا۔ وہ بزرگ کیا آئے کہ گویا غزنین کی کہانیوں اور روایتوں کی ایک زندہ کتاب ہاتھ آ گئی، عمر اسی نوے کے قریب ہوگی، کمر خمیدہ منہ میں دانت نہیں، ہاتھ میں جریب وہ اس شان سے آئے، اور غزنین کی بربادی و تباہی کی داستان سنانے اور یہاں کے بزرگوں کے نام و نشان بتلانے لگے، بہرحال اس خضر کی رہنمائی میں ہم پرانے غزنین کی سیر کو نکلے۔

غزنین کے آثار باقیہ۔ موجودہ شہر سے کئی میل دور وہ مقام ہے جو سلاطین محمودی کا پایۂ تخت تھا اور اس مقام کی بالکل مخالف سمت موجودہ شہر کی دوسری طرف غزنین کا پرانا گورِ غریباں ہے، قدیم آثار باقیہ میں یہاں اب صرف چند چیزیں باقی ہیں حکیم سنائی، سلطان محمود، سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم کے مزارات اُن کے علاوہ ایک مزار حکیم بہلول دانا کی طرف منسوب ہے اور بعض دوسرے بزرگوں کے مزارات ہیں شاہی عمارتوں کے سلسلے میں صرف چند منار کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

حکیم سنائی کا مزار۔ حکیم و شاعر اقبال کو حکیم شاعر سنائی کے مزار دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا مہمانخانہ سے نکل کر پیادہ ہم حکیم موصوف کے مزار کی طرف چلے، یہ مزار موجودہ آبادی کی پچھم طرف آبادی سے ہٹ کر عام مسلمانوں کے گورِ غریباں میں واقع ہے عام شاہراہ کی سڑک چھوڑ کر ایک فرلانگ تک دوسرا راستہ گیا ہے، مقبرہ سے باہر چند پتھریلی قبریں ہیں جن میں سے بعض پر متاخر زمانہ کے کتبے لگے ہیں حکیم سنائی کا مقبرہ ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر ہے پہلے مختصر سا صحن ہے جس میں بھی چند قبریں ہیں، ایک قبر پر لکھا ہے کہ "یہ حکیم سنائی کے خادم خاص کی قبر ہے" اس کے بعد خود حکیم کے مزار کی عمارت ہے، اوپر گنبد ہے نیچے پختہ قبر ہے مزار کے اندر جانے کے لئے صرف ایک چھوٹا سا دروازہ ہے، قبر پختہ ہے اس کے اوپر پتھر ہے جس میں بخط عربی حکیم ممدوح کی تاریخ وفات منقوش ہے پوری عبارت تو میں نے لکھی نہیں یادگار کے طور پر جو سطریں لکھ لی تھیں وہ حسب ذیل ہیں۔

کان وفات الشیخ العالم الفاضل العارف قطب المحققین طوطی شکرستان

فصاحت بلبل بوستان بلاغت مظہر اسرار معانی مطلع انوار ...
لشیخ ... یعنی مجدود الدین السنائی سنة خمسمائة وخمس عشرین

گزشتہ سال کے معارف میں حکیم سنائی کی تاریخ وفات پر خاکسار کا ایک مضمون نکلا تھا جس میں موصوف کی وفات ۵۴۵ھ میں ثابت کیگئی تھی بعض محققین حال ۵۴۹ھ کی تاریخ ثابت کرتے ہیں اس کتبہ میں حضرت جامی وغیرہ کی عام روایت کے مطابق ۵۲۵ھ کی تاریخ وفات درج ہے اگر یہ تحقیق ہو سکتا کہ یہ کتبہ حکیم کی وفات کے بعد ہی زمانہ قدیم میں لگا ہے تو اس سالِ وفات کے قبول کرنے میں کیا عذر ہو سکتا تھا مگر جہاں تک قیاس ہے یہ کتبہ بہت بعد کو لگایا گیا ہے اور اس میں وہی حضرت جامی کی بتائی ہوئی مشہور تاریخ لکھدی گئی ہے واللہ اعلم

مزار کے اندر پہنچکر بطریق مسنون دعا پڑھی۔

حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں ہم سب اس منظر سے متاثر تھے مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا، وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے اللھم اغفرلہ وارحمہ

یہ تو فقیروں کا جھونپڑا تھا یہاں سے نکل کر بادشاہوں کے محل کی طرف جانے کا خیال ہوا سڑک پر موٹریں کھڑی تھیں یہاں سے سڑک تک پیادہ چل کر موٹروں تک پہنچے

افغانی سواروں کا دستہ۔ سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ اتفاقاً افغانی سواروں کا ایک مختصر دستہ سڑک سے گزرا گھوڑوں کی شکل وصورت اور شرارت سپاہیوں کی عمدہ اور صاف وردیاں ان کی ہیبتناک اونی ٹوپیاں اور اسلحہ کی چمک دمک دیکھکر ہمارے نوجی جسم میں خون دوڑنے لگا، شگونِ نیک یہ لیا کہ سلطان محمود کے مزار پر جانے کا

خیال ہے، اور یہ سلطان کے خیالی جلوس کی سواری ہے، کاروان رفتہ کا یہ نشانِ قدم بھی بسا غنیمت معلوم ہوا آج جبکہ بڑے بڑے کشور کشا سلاطینِ اسلام غیر ملکی تسلط کی ذلت سے اپنی قبروں میں بےچین ہوں گے یمین الدولہ کہف الاسلام سلطان محمود اپنی قومی حکومت کے زیر سایہ آرام کی نیند سو رہا ہے۔

قدیم غزنین میں۔ موٹر میں ملا قربان ہمارے ساتھ تھے وہ ہر جگہ اپنے سنے سنائے معلومات کا اظہار کرتے جاتے تھے اصلی اور پرانا غزنین موجودہ آبادی کے پورب طرف ہے، میرے اندازہ میں یہاں سے دو تین میل کے فصل پر واقع ہوگا، اِدھر اُدھر منتشر طور پر ٹیلے دکھائی دیئے بعض کچے مکانات آباد بھی معلوم ہوئے، سب سے پہلے دو آمنے سامنے بلند مینارے نظر آئے ان دونوں میناروں کے بیچ میں شاید فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کا فرق ہوگا ملا قربان نے کہا یہ سلطان محمود کے وقت کے دو مینارے ہیں ان پر اس زمانہ میں جب سلطان کی سواری نکلتی تھی نقارے بجتے تھے یہ دو مینارے پتلی لکھوری اینٹوں کے تھے۔

آگے بڑھ کر سڑک سے ہٹکر ایک ٹیلہ پر ایک مزار کا قبہ دکھائی دیا ملا نے بتایا کہ یہ بہلول دانا کا مزار ہے، پھر دوسری طرف ایک گنبد نظر آیا یہ بھی سڑک سے ہٹا ہوا تھا، ملا نے کہا کہ یہ سلطان ابراہیم غزنوی کا مزار ہے، اس سے آگے ایک اور قبہ ملا جس کی نسبت یہ اطلاع دی گئی کہ یہ سلطان محمود کے باپ سلطان سبکتگین کا مزار ہے یہ اپنی پرانی حالت میں تھے اور لکھوری اینٹوں سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے

سلطان محمود کا مزار۔ موجودہ غزنین سے سلطان کے مقبرہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے مزار کے قریب پہنچکر پہلے ایک مختصر سی آبادی ملی اس کو طے کرکے ایک گلی سے

مزار کے دروازہ کے قریب جاکر موٹریں کھڑی ہوئیں، دروازہ سے پہلے ایک پہاڑی سے ایک چشمہ اوپر سے نیچے گرتا ہے اور پھر کر اس مختصر آبادی کے لئے فطری واٹر ورکس کا کام انجام دیتا ہے، نیچے پتھر کا بنا ہوا ایک شیر کا دہانہ ہے اسی دہانہ سے ہوکر یہ پانی نیچے گرتا ہے ملا نے کہا یہ چشمہ بہت پرانا ہے، اور سلطان کے زمانہ سے جاری ہے سرور خاں نے فرمایا یہی وہ کاریز ہے جس کا ذکر فلاں شاعر کے شعر میں آیا ہے (شعر مجھے یاد نہیں رہا)

نہر مذکور سے چند قدم کے فاصلہ پر مزار کا بڑا اور بلند دروازہ ہے اس کے بعد ایک چھتہ ہے جس کو طے کرکے ایک مختصر باغ میں پہنچے باغ کے ایک طرف سلطان کے مزار کا گنبد نظر آیا اندر داخل ہوئے تو سلطان کی قبر نظر آئی، آہ! یہ اس سلطان کی قبر ہے جو دیوار چین سے لیکر سومنات گجرات تک کے ملکوں پر فرمانروا تھا جس کی ہیبت و جلالت سے بڑے بڑے گردن کش سر اطاعت جھکا دیتے تھے جس نے دنیا کے خزانوں کو غزنین کے گوشہ گوشہ میں بکھیر دیا تھا جس کے لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپیں درۂ خیبر اور درہ کوہاٹ کی پہاڑیوں، سندھ اور راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ صحراؤں اور بحر عرب کے ساحلوں ترکستان و خوارزم کی وادیوں ختا و ختن کے میدانوں اور ایران کے خیابانوں کو دم کے دم میں طے کرتی تھیں جس کے سپاہی گرمیوں کا موسم ایران و ترکستان کے فتوحات میں اور سردی کے دن ہندوستان کے زیروزبر کرنے میں بسر کرتے تھے جس کے دربار میں شعرائے غزنوی کا وہ جھرمٹ لگا رہتا تھا جس کی شکروہنی سے آج فارسی زبان دنیا کی غیرفانی زبان بن گئی ہے آج وہ سلطان کس بیکسی و بیچارگی کے عالم میں ایک سنسان

باغ کے اندر یکہ و تنہا خاک بستر پر دراز ہے
تخیل کے کانوں کو فرخی کا مرثیہ مزار کی زبانِ حال سے اب تک سنائی دے رہا ہے۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار　　چہ فتاد است کہ امسال دگرگون شد کار
ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا　　دشمنے روے نہادہ است دریں شہر و دیار
میر می خوردہ نگردی کہ بخفتہ است امروز　　دیر برخاست مگر رنج رسیدش ز خمار
خیز شاہا کہ رسولانِ شہان آمدہ اند　　ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تواند کہ برانگیزد ازیں خواب ترا　　خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار اے خواجہ خوی تو نبود　　ہیچ کس خفتہ ندید است ترا زیں کردار
یکدمک بائے ورخانۂ بالیست نشست　　تا بدیدندی تو عزیزان و تبار
بحصار از فزع و بیم تو رفتند شہان　　تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بحصار
شعر را بہ تو بازار برافروختہ بود　　رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

مزار کے اوپر جو گنبد بنا ہے اس کو امیر حبیب اللہ خاں مرحوم نے ۱۳۲۳ھ میں بنوایا ہے جس کا کتبہ بخطِ نستعلیق فارسی میں سنگ مرمر کے ایک پتھر پر دیوار کے اندر لگا ہے مگر خود قبر سلطانی غالباً عہد قدیم کی تعمیر ہے کیونکہ اس کے اوپر سلطان کی تاریخ وفات اور کلمات دعائیہ جس عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں وہ خط کوفی کے مشابہ ہے اور زبان بھی خالص عربی ہے یہ عبارت قبر کے اوپر اور ہر چہار طرف اسی خط میں لکھی ہوئی ہے جس کا پڑھنا آج بہت آسان نہیں ہے روا روی میں میں نے صرف ایک سمت کی عبارت پڑھی جس میں سلطان کی وفات کی تاریخ منقوش ہے۔

توفی برحمۃ اللہ علیہ و نوّر حفرتہ وابیض وجہہ عشیۃ یوم الخمیس

لسبع بقین[۵] من شهر ربیع الآخر لسنة احدی وعشرین واربع مائة

ترجمہ۔ وفات پائی سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی قبر کو خدا منور کرے اور اس کے چہرہ کو روشن کرے پنجشنبہ کی شام کو ربیع الآخر کی سات راتیں باقی تھیں (یعنی ربیع الآخر کی تیئیسویں کو) سنہ ۴۲۱ھ

سلاطین غزنوی کی قدیم ترین تاریخ زین الاخبار میں بھی یہی تاریخ لکھی گئی ہے "وفات امیر محمود رح روز پنجشنبہ بود بیست و سوم ربیع الآخر سنۃ احدی وعشرین واربع مائۃ (ص ۹۲)"

حضرت داتا گنج بخش لاہوری کے والد بزرگوار کا مزار

ان شاہی مزارات کی زیارت سے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کو لاہور کی مناسبت سے حضرت داتا گنج بخش لاہوری جن کا مزار لاہور میں ہے ان کے والد ماجد رح کے مزار کی تلاش ہوئی ملا قربان نے کہا میں وہ مزار جانتا ہوں چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق موٹر نے پرانے غزنین کے ویران وسنسان میدانوں کو طے کرنا شروع کیا اور آخر ایک مقام پر لے جا کر توقف کیا آگے موٹر کا راستہ نہ تھا چنانچہ ملا صاحب مع ڈاکٹر صاحب وغیرہ اتر کر پیادہ گئے اور زیارت کر کے واپس آئے میں درد سینہ کی شکایت کے سبب نہ جا سکا

لائے خوار کا مزار حکیم سنائی کی توبہ کی حکایت کے سلسلہ میں ایک مجذوب فقیر لائے خوار کا ذکر آتا ہے جس نے کہا تھا "یکوری سنائی می خورم" کہ سنائی سے بڑھ کر بیوقوف کون ہوگا

---

[۵] جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے سفرنامہ افغانستان میں اس کتبہ کو اس طرح پڑھا ہے "یوم الخمیس سبع عشر من ربیع الآخر سنۃ احدی عشر و اربعمائۃ" (روز پنجشنبہ ۱۷ ربیع الآخر سنہ ۴۲۱ھ) اور یہ پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ سلطان کی وفات اس تاریخ کو ہوئی جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی تاریخ وفات ہے" (یعنی سترہ) مگر موصوف کی یہ خوشی بجا نہیں ان سے کتبہ کی عبارت پڑھنے میں سہو ہوا ہے۔

جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدح و ستائش میں خرافات نظم کرتا ہے۔ اور ان کو جا کر سناتا ہے، حکیم پر اس مجذوب کے اس فقرہ کا اثر ہوا اور توبہ کی ملا قربان موجودہ غزنین کے بازار سے گزرتے ہوئے ایک گلی سے ایک مسجد کے اندر لے گئے اور بتایا کہ یہ اس لائے خوار کا مزار ہے۔

غزنین کی رات۔ قریب شام ان مقامات کی سیر و زیارت سے فراغت ہوئی سردی شروع ہو چکی تھی غزنین کابل سے بھی ایک ہزار فیٹ بلند ہے اس لئے یہاں کابل سے بھی زیادہ سردی ہے۔ مغرب کا وقت آیا تو انگیٹھیوں کا سامان ہوا۔

ساتھ کے سرکاری خدام نے کھانا تیار کیا اور ۸ بجے شب کے قریب میز پر کھانا چنا گیا وہی کابل کے کھانے تھے غزنین کے سردے بھی عمدہ ہوتے ہیں کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر سلطان محمود کے غزنین میں شب بسر کرنے کے لئے بستروں پر دراز ہوئے۔

مُقر قلاتِ غلزی اور قندھار

منزلیں۔ ۱۳ر اکتوبر کی صبح کو غزنین سے آگے روانہ ہوئے ہمارا مختصر قافلہ آج بھی دو موٹروں اور دو لاریوں پر مشتمل ہے غزنین کے بعد موٹر کی پہلی منزل مُقر ہوتی ہے اور دوسری قلاتِ غلزی مگر رفیقوں کی جلدی کے باعث آج مقر اور قلات کی دو منزلیں ایک ساتھ طے کرنی ہیں۔

غزنین سے مُقر نوّے میل ہے پہلے عموماً یہ راستہ سات منزلوں میں ختم کیا جاتا تھا پہلی منزل قلعہ نانی، دوسری قرہ باغ، تیسری قلعہ غوجان، چوتھی قلعہ مکوڑا

پانچویں چشمہ سرو چھٹی قلعہ ترین[1] پھر قلات مگر موٹر کے لئے یہ سات منزلیں چند گھنٹوں کا راستہ ہے چنانچہ ہم ۶ بجے صبح کو غزنین سے روانہ ہوگئے اور ۱۱ بجے دوپہر کو مُقر پہنچ گئے راستہ نہایت صاف اور ہموار تھا جگہ جگہ گاؤں ملے وادیوں میں کھیتوں کے بڑے بڑے تختے نظر آئے جابجا چشمے بھی بہہ رہے تھے۔

مُقر یعنی پرانا بیہق۔ بیہق ایک پرانے تاریخی شہر کا نام ہے جہاں سے بڑے بڑے ائمہ حدیث مورخین اور اہل ادب و انشا پیدا ہوئے ہیں یاقوت نے معجم البلدان میں بیہق کے علاقہ کو ایک پورا ضلع قرار دیا ہے اور جس کی جائے وقوع نیشاپور، قومس و جُوین کے بیچ میں بتائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ بیہق کی ابتدائی حد سے نیشاپور تک ساٹھ فرسنگ ہیں (یعنی موجودہ ایک سو تیس میل) اس کا پرانا صدر مقام خسرو گرد تھا پھر سبزوار ہوگیا اس کے اندر تین سو اکیس گاؤں تھے، اس کا فارسی تلفظ بیہہ ہے مگر عربوں نے اپنے قاعدہ سے اس کو بیہق بنا دیا اور وہی مشہور ہوگیا، ابوبکر احمد بن حسین مشہور بہ امام بیہقی شافعی جن کی سنن بیہقی اور دلائل النبوۃ مشہور کتابیں ہیں یہیں کے تھے۔

نوجوان افغانوں کا دعویٰ ہے کہ پرانا بیہق یہی ہے چنانچہ ہمارے فاضل افغان رفیق سفر سرور خاں گویا نے بڑے وثوق کے ساتھ مجھے اس کا یقین دلایا مُقر کے قریب دو قبروں کے روضے دکھائی دئے، فاضل مذکور نے بتایا کہ ان میں سے ایک ابوالفضل بیہقی کی قبر ہے اور دوسری ابونصر مشکانی کی ابوالفضل بیہقی غزنوی خاندان کا مشہور مورخ ہے سنہ ۴۷۰ھ میں وفات پائی ہے ابونصر مشکانی

---

[1] ترین پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے۔

بھی اسی عہد کا ادیب و مورخ ہے جس کی تصنیف مقامات پچھلے مصنفین کا ماخذ ہے

مقر میں داخلہ اور روانگی۔ مقر ایک وسیع و خوش فضا میدان میں واقع ہے آبادی بہت ہی معمولی ہے افغانوں کا ایک فوجی دستہ ایک افغان کرنل کی ماتحتی میں یہاں رہتا ہے۔

مقامی سرکاری افسروں کو ہم لوگوں کے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی جیسے ہی موٹر آکر رکی گارڈ آف آنر نے جو پہلے سے وہاں کھڑا تھا مہمانوں کو اعزازی سلامی دی دل نے کہا اسلامی مملکت میں آکر غیر ملکی مسلمان بھی بیگانہ نہیں رہتا اور اس اعزاز کا مستحق قرار پاتا ہے جو اس کو اپنے وطن میں بھی میسر نہیں آزادی اور غلامی کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے

یہاں کی سرکاری عمارت نہایت سلیقہ سے پختہ دو منزلہ بنائی گئی ہے اوپر کی منزل مہمانوں کے لئے ہے متعدد کمرے ہیں جن میں خاصہ آرام دہ فرنیچر ہے بیت الخلا جدید اصول (فلشنگ سسٹم) کے مطابق بنا تھا عمارت بھی اینٹوں کی معلوم ہوتی تھی عمارت کے پاس ہی چھوٹی سی نہر جاری تھی سامنے کچھ سرسبز و شاداب درختوں کی قطار تھی۔

تعجب آتا تھا کہ ایسا خوش فضا اور پرسکون مقام اور آبادی سے یوں خالی ہو اگر یہ مقام ہندوستان میں ہوتا تو بڑے بڑے امرا کی کوٹھیوں سے معمور ہوتا زمانہ کے انقلاب کی یہ کیسی عبرت انگیز تصویریں ہیں کہ کبھی ویرانہ پررونق شہر اور کبھی پررونق شہر ویرانہ بن جاتا ہے۔

بالائی منزل پر جا کر ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا پہلے گرم دودھ کا ایک ایک

پیالہ مہمانوں کو پیش کیا گیا پھر بے دودھ کی سبز چائے آئی جس کا مزہ مجھے تو تازہ بنفشہ کے جوشاندہ سا معلوم ہوتا ہے تھوڑی دیر کے بعد میز پر کھانا چنا گیا کھانے سے فارغ ہو کر ہم آگے بڑھنے کو تیار ہو گئے چلتے وقت بھی فوجی دستہ نے اعزازی سلامی دی ایک بجے موٹروں نے قلات کی سمت حرکت کی راستہ صاف اور ہموار تھا۔

قلات غلزئی۔ قلات دو ہیں ایک قلاتِ بلوچ اور دوسرا قلاتِ غلزئی پہلا بلوچستان میں واقع ہے جو آج کل ہندوستان کے ماتحت ہے اور دوسرا غزنین اور قندھار کے بیچ میں ہے پہلے افغانستان کی سرحد بلوچستان تک تھی اور قلاتِ بلوچ کا امیر شاہ افغانستان کا ماتحت تھا۔ ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۵ھ میں شجاع الملک شاہ افغانستان کو دوبارہ تخت نشین کرنے کے لئے جو انگریزی فوج سندھ اور قندھار کے راستہ سے کابل گئی تھی اس نے واپسی میں قلات بلوچ کے امیر محراب خاں کو مہمانداری کے دھوکے سے قتل کر کے قلاتِ بلوچ پر قبضہ کر لیا مگر اس کے جوانمرد بیٹے نصیر خاں نے بڑی بہادری سے انگریزی فوج کو شکست دی غرض شاہ افغانستان کی امداد کا یہی بہانہ تھا جس نے قلات اور سندھ کو ہندوستان کا ماتحت بنا دیا۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے کر دی کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے قلاتِ بلوچ کے محراب خاں کو قلاتِ غلزئی کا حاکم بنا دیا ہے۔

قلات کی اصل مجھے قلعات معلوم ہوتی ہے قلعہ کی جمع کثرتِ استعمال سے قلات ہو گیا ہے۔

مقر سے ایک بجے چل کر بجے شام کو قلات غلزئی پہنچے یہ غلزی اور توخی افغانوں کی جائے سکونت ہے مگر خیر قلات کی آبادی بہت ہی مختصر ہے یہاں کا سرکاری مہمانخانہ کچی دیواروں کا ہے گو وسیع ہے مگر پرانا بنا ہوا ہے ہمارے پہنچنے کی اطلاع یہاں پہلے سے تھی لیکن اتفاق سے خانساماں موجود نہ تھا تھوڑی دیر میں بیچارہ دوڑتا ہانپتا آیا اور مہمانخانہ کے دروازے کھولے کمرے متعدد تھے اور سامان بھی ستھرا تھا ہر کمرہ میں پردہ دار مسہریاں تھیں اور مسہریوں پر بستر اور کمل لگے تھے ہم سب میں سے ہر ایک نے ایک ایک مسہری پر قبضہ کیا۔

مہمانخانہ کھلے میدان میں واقع ہے آس پاس کوئی آبادی نہیں سامنے پہاڑی ہے اس پر ایک قلعہ ہے جس میں افغانی فوج رہتی ہے قلعہ سامنے سے معلوم ہوتا ہے اس سے ذرا ہٹ کر قصبہ کی آبادی ہے قلات غزنین سے بھی ایک ہزار فیٹ بلند ہے اور کابل سے دو ہزار فیٹ اونچا یہ چار بجے شام کا وقت تھا مگر ہوا اتنی تیز چل رہی تھی اور ٹھنڈک ایسی تھی کہ امرالتوبر کو عصر کی نماز کے لئے گرم پانی سے وضو کرنا پڑا۔

مہمانخانہ سے باہر کھلے میدان میں جو سطح زمین تھی ریت کی بڑی کثرت نظر آتی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پانی کا بہاؤ ہے اس کی دوسری دلیل یہ نظر آتی کہ مختلف رنگ کے پتھروں کے خوشنما اور چکنے ٹکڑے اور کنکریاں بڑی کثرت سے ادھر اُدھر پڑی نظر آتی تھیں چنانچہ چند چمکدار اور رنگین کنکریاں یادگار کے طور پر ہم نے چن کر رکھ لیں اسی طرح سنہ ۱۹۲۵ء کے سفر عرب میں پورٹ سوڈان کے ساحل پر بھی ہم کو ایسے ہی پتھر ملے تھے تو ہم نے وہاں سے بھی پتھر کے چند چھوٹے ٹکڑے

یادگار کے طور پر رکھ لئے تھے

مغرب کے بعد ہی یہاں ٹھنڈک ایسی ہوگئی جو ہمارے یہاں دسمبر او جنوری کے مہینوں میں ہوتی ہے، چنانچہ آتشدانوں میں آگ، جلائی گئی۔

ایرانی اور افغانی فارسی۔ یہاں رفقائے سفر میں سے پروفیسر ہادی اور سرور خاں گویا میں ایرانی اور افغانی فارسی کی باہمی فضیلت پر ایک دلچسپ گفتگو ہوئی پروفیسر صاحب ایرانی فارسی کے مداح تھے اور گویا اپنی مادری افغانی فارسی کے دیر تک مباحثہ رہا۔ گویا کا دعویٰ تھا کہ فارسی اصل میں ہماری زبان ہے ہم نے بخارا میں (سامانیوں کے عہد میں) اس کو پیدا کیا اور غزنین میں غزنوی شعرا کے ہاتھوں اس کو نشوونما بخشا، رودکی سے لیکر غضائری، عسجدی، اسدی، دقیقی، فردوسی، عنصری، سلمان اور سنائی وغیرہ ہمارے تھے اور انھیں کی سحرپردازانہ کوششوں کا نام ادبیات فارسی ہے پروفیسر صاحب متوسطین سعدی حافظ اور متاخرین کے نام پیش کرتے تھے۔

سرور خاں گویا نے ایرانیوں کی متکلمانہ زبان کا وہ خاکہ اڑایا کہ ہم لوگ ہنستے ہنستے لوٹ گئے انھوں نے کہا ہم کو اگر آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے تو صاف صاف شکریہ اور سپاس ادا کریں گے، ایرانیوں کی طرح جھوٹی بناوٹ کے ساتھ بجانِ شما اور بسرِ شما اور قربانت شوم نہیں کہیں گے۔ ایران اور افغانستان میں فارسی کا جو جدید لٹریچر پیدا ہوا ہے اس کی نسبت کہا کہ ہم نے ادبیات جدّی اور سنجیدہ لٹریچر پیدا کیا ہے اور انھوں نے صرف تفریحی ادبی، آخر میں لہجہ پر گفتگو آئی ایرانی اس لفظ کو جس کے آخر میں الف نون ہو واو نون پڑھتے ہیں مثلاً ہمان کو ہمون اور آن کو اون (نون کے اظہار کے ساتھ) سرور خان نے جل کر کہا "آقا!

درست است دو کانِ شما . . . . . است و زبانِ شما زبون" اس پر سب نے قہقہہ لگایا!

قلات کی رات۔ رات زیادہ آچکی تھی سب اپنے اپنے بستروں پر آرام کرنے گئے ہوا بڑی تیزی سے رات بھر چلتی رہی مگر چونکہ کھڑکیاں شیشوں کی تھیں اور وہ بھی بند اور کمروں میں آتشدان جل رہے تھے، اس لئے سردی نہیں لگی لیکن ساتھ کے افغانی سپاہیوں کو شاباشی دینی چاہیئے کہ وہ اس کڑاکے کی سردی اور ہوا میں باہر چھولداریوں میں بہت آرام سے میٹھی نیند سوتے رہے۔

قلات سے روانگی۔ آج نومبر کی پہلی تاریخ ہے صبح سویرے آنکھ کھلی گرم پانی موجود تھا وضو کر کے صبح کی نماز ادا کی ساتھ کے رفیقوں نے گرم پانی کی پیالیوں کی مدد سے چہرے صاف کئے تھوڑی دیر میں چائے آئی ناشتہ کیا چائے پی اور آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوئے۔

روانگی کے وقت یہاں بھی فوجی دستہ نے اعزازی سلام کیا ۸ بجے کے قریب روانگی ہوئی۔

قندھار کا راستہ۔ سردی کا وہی عالم تھا موٹے موٹے کپڑوں میں لپٹے اور اوپر سے اوورکوٹ وغیرہ پہنکر موٹروں میں بیٹھے موٹر کی کھڑکیاں گو بند تھیں مگر ہوا اور سردی کا اثر اس کے اندر تک سرایت کر رہا تھا۔

افغانستان کے اس حصہ میں قلات تک اونچائی ہوتی چلی آئی ہے قلات سے نکل کر نصف راستہ کے بعد سے اُتار شروع ہو جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ سردی کم اور گرمی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ قندھار پہنچکر پنجاب کے شہروں کے قریب قریب کا موسم آجاتا ہے، ہندوستان میں اخیر جنوری میں جاڑوں کے دنوں میں دہلی سے بمبئی جائے تو اچھے خاصے گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے سوار ہو جائیے

مگر بھوپال کے بعد سے سردی کا زور کم ہونا شروع ہوگا، منماڈ کے بعد سے کپڑے اُترنے شروع ہو جائینگے یہاں تک کہ جب آپ بمبئی پہنچیں گے تو بدن پر گرمی کے کپڑے اور ہاتھوں میں پنکھے ہونگے اسی طرح جیسے جیسے ہم قلات سے دور اور قندھار سے نزدیک ہوتے جاتے تھے جاڑوں کے کپڑے اترتے جاتے تھے۔

قلات سے قندھار تک کا راستہ اچھا نہیں عموماً راستہ گو ہموار ہے تاہم کہیں کہیں چڑھائیاں بھی آتی جاتی تھیں راستہ میں ایک بہت بڑا افغانی قلعہ سامنے سے گزرا راہ میں چشمے بھی جابجا بہہ رہے تھے دیکھنے میں یہ علاقہ بھی سرسبز وشاداب معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی وادیاں کھیتوں سے آباد تھیں۔

اطرافِ خیبر فتنہ زا کیوں ہیں۔

افغانستان کے پچھلے حوادث پر جب نظر کیجئے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ خیبر کے اطراف ہی در اصل اس کے ہر فتنہ کی جڑ ہیں ان اطراف کے قبائل خواہ ہندوستان ہو یا افغانستان جہاں موقع ہو وہ لوٹ مار کے لئے آمادہ رہتے ہیں اور یہیں سے بغاوتیں اُٹھتی ہیں، کبھی آپ نے غزنین اور قندھار کے اطراف میں کسی بغاوت کا قصہ نہیں سنا ہوگا حالانکہ اگر لڑائی آ پڑے تو اس میں ادھر کے پٹھان بھی کم نہیں دُرانی کے ہندوستانی حملوں کے سپاہی یہی تھے ہم نے پشاور سے کابل تک اور کابل سے قندھار تک افغانستان کے جو علاقے دیکھے اس سے یقین آگیا کہ اس اختلاف نتائج کی تہ میں ان دونوں مختلف سمتوں کی معاشی کیفیتوں کا اختلاف ہے خیبرستان تمام تر سنگستان اور پتھریلا ہے زمین قابل زراعت بہت کم ہے اس لئے اُدھر کے قبائل اپنے پیٹ کے لئے اس بات پر مجبور ہیں کہ فتنے پیدا کریں

بغاوتیں اٹھائیں اور لوٹ مار کر کے پیٹ بھریں، برخلاف اس کے کابل سے قندھار تک کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے، اور لوگ کھیتی باڑی اور تجارت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے اور مشغول رہتے ہیں، اس لئے طبعًا امن پسند ہیں۔

قندھار کی منزلیں۔ قلات سے قندھار تک پرانی منزلیں حسب ذیل تھیں۔

۱۔ قلعہ قلات سے تیر انداز تک جو ترنک نام ایک ندی کے کنارہ آباد ہے اور جہاں سے دُرانی قوم کا مسکن شروع ہو جاتا ہے

۲۔ قلعہ تیر انداز سے شہر صفا تک اس شہر کو تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی کے مدار المہام قاضی فیض اللہ خاں نے آباد کیا تھا۔

۳۔ شہر صفا سے کاریز علہدو تک، یہ ایک چشمہ ہے۔

۴۔ کاریز علہدو سے شہر قندھار تک۔

ان میں سے ہر منزل بارہ تیرہ، چودہ اور بعض سولہ کوس کی مسافت پر آبادی کی مناسبت سے قائم کی گئی تھی اب ان میں سے بعض منزلیں باقی ہیں اور بعض بدل گئی ہیں، مثلاً اب قلات سے پہلی منزل قلعہ جلدگ، دوسری تیر انداز، تیسری شہر صفا، چوتھی مانجھا، پانچویں موسند ہے، مگر تیز رفتار موٹروں نے اب ان منزلوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ صرف پیدل اور جانوروں پر سوار ہو کر چلنے والوں کے حق میں ان منازل کا حکم باقی رہ گیا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں کہ راستہ کی خرابی کے باوجود قلات سے ۸ بجے چل کر ۱۲ بجے چار گھنٹوں میں قندھار پہنچ گئے۔

قندھار میں داخلہ۔ سواد شہر کے قریب پہنچنے کے ساتھ شہر کے کچھ گنبد اور مینارے دکھائی دینے لگے اور معلوم ہونے لگا کہ ہم کسی آباد مشرقی شہر میں

داخل ہو رہے ہیں، یورپ میں جائیے تو پہلے اکثر مقاموں پر آبادی کی دود کش چمنیاں دکھائی دیں گی، شہر سے پہلے ایک بڑا میدان جس کے ایک طرف بنگلہ نما کچھ فوجی عمارتیں تھیں نظر آیا، یہ میدان بھی کسی فوجی غرض کے لئے معلوم ہوتا تھا شاید ہوائی جہازات اور فوج کی چاند ماری کی جگہ ہو اس کے بعد اصل شہر آیا، اللہ! اللہ! یہ شہر تو افغانستان کے تمام گزشتہ شہروں سے بڑا متمدن پر رونق اور کاروباری ہے کشادہ سڑکیں با ترتیب دکانیں مسقف اور گنبد والی عمارتیں مناروں اور گنبدوں والی مسجدیں۔

پہلے موٹریں ایک بازار سے گزر کر ایک بڑے گنبد دار چوراہہ پر پہنچیں، اس گنبد کے چاروں طرف سڑکیں اور ہر سڑک پر بازار تھا اس کی کیفیت شہر حیدرآباد دکن کے چار مینار کی سمجھئے بجز اس کے کہ چار مینار کے اندر ہو کر راستے نہیں جاتے اور اس کے اندر ہو کر سب راستے جاتے ہیں پہلے موٹروں نے اس سڑک سے جانا چاہا جو سرکاری عمارتوں کی طرف جاتی ہے اور جس کا نام شاہ بازار ہے غالباً اسی لئے کہ وہ شاہی عمارتوں کی طرف جاتی ہے مگر معلوم ہوا کہ وہ سڑک مرمت کے لئے بند ہے اس لئے دوسری سڑک سے ہو کر شہر کے باہر کی سڑک سے عمارتوں کی پشت کی طرف سے ہم ارک یعنی قلعہ شاہی میں پہنچے اور یہیں ایک عالیشان اور وسیع عمارت کی دوسری منزل پر قیام ہوا۔

قندھار کا ارک۔ قندھار کی شاہی قیام گاہ کی یہ عمارت تمام پچھلے شہروں کی عمارتوں سے وسیع، بلند، خوشنما، با آسایش اور پر تکلف ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ دارالحکومت تھا تو یہ ایوان شاہی تھا شہر کا قلعہ جس میں یہ ارک

واقع ہے بدستور کچی مٹی کا بنا ہوا ہے مگر اس کا عرض اس قدر ہے کہ دو تین سوار اس پر چل سکتے ہیں جابجا گوشوں پر برجیاں بنی ہیں ایک دو جگہ نالیوں میں بارش کے بہاؤ سے دیواریں کچھ کچھ کٹ گئی ہیں، دیواریں اتنی صاف اور چکنی ہیں کہ کسی مصالحہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اسی ارک کے اندر تمام سرکاری عمارتیں ہیں اور سب کے آخر میں دو منزلہ عمارت ہے جو ہماری قیامگاہ ہے اسی پر اس ارک کی عمارت کا خاتمہ ہوتا ہے اس کے شمالی رخ پر بلند دیواروں کے اوپر دوسری منزل ہے اور اس دوسری منزل کے شمالی رخ بڑے بڑے اونچے ستونوں پر چھت ہے اور اس کے اوپر افغانستان کا شاہی جھنڈا لہرا رہا ہے یہ رُخ اسی شاہ بازار کی طرف ہے جس کا نام پہلے آیا، ارک کی دیوار کے نیچے اس رخ پہلے ایک وسیع میدان ہے جس کو اب باغ عمومی (پبلک گارڈن) بنایا جا رہا ہے داہنے بائیں دو باغ لگ رہے ہیں ان دونوں کے بیچ سے چوڑی سڑک نکل کر سیدھی شاہ بازار کی سڑک میں جا کر مل جاتی ہے پھر دو سڑکیں ارک کے نیچے سے دونوں باغوں کے پیچھے سے ہلالی شکل میں نکل کر شاہ بازار کی سڑک میں ملائی گئی ہیں اور ان ہلالی سڑکوں کے کنارے کنارے اُدھر سے ایک قطار میں مسلسل ہم شکل دکانیں بنائی گئی ہیں، جن میں بعض آباد ہیں بعض کی تعمیر نامکمل ہے۔

ارک کے اندر۔ ہماری قیامگاہ کے جنوب رخ گھرا ہوا ایک صحن ہے جس میں چمن بندی ہے بیچ میں فوارہ ہے اور اس صحن کے دوسری طرف جنوب میں بالمقابل دوسری عمارت ہے یعنی یہ صحن ان دونوں کے بیچ میں ہے اس صحن سے

ہو کر باہر کا صدر دروازہ یا پھاٹک مغربی رخ کو واقع ہے، پھاٹک سے داخل ہوں تو صحن میں آئیے صحن کے شمالی اور جنوبی سمتوں میں مذکورۂ بالا و عمارتیں ہیں ہماری قیامگاہ شمالی عمارت ہے ادھر آپ کو زینہ ملے گا، زینہ پر چڑھیئے تو ارک کی اُس چھت پر آگئے جہاں ہم ٹہرے ہیں اوپر نیچے اور مضبوط ستونوں پر شمال کے رخ شاہ بازار اور باغ عمومی کی سمت کا کھلا منظر ہے یہ گویا سائبان ہے جو ہلالی صورت یا نصف دائرہ کی شکل میں ہے، سائبان سے اندر داخل ہو جائیے، پہلے دو درجوں کا وسیع ہال ملے گا پہلے پہلا درجہ آئے گا یہ شاید دربار شاہی کے منتظرین کی جگہ ہوگی بالفعل یہ اس عمارت کا ڈائننگ ہال (کھانے کا کمرہ) تھا یہاں کھانے کی میزیں بچھی تھیں کمرہ کی پوری زمین میں ولایتی ساخت کا ایک قالین بچھا تھا ہال کے دوسرے درجہ میں جا بجا کوچ اور مختلف شکلوں میں عمدہ میزوں کے گرد صاف ستھری کرسیاں بچھی تھیں اس ہال کے دونوں مغربی و مشرقی رخ پر سونے کے متعدد کمرے تھے ہر کمرہ سامان فرنیچر اور یورپین ساخت کی لوہے کی کمانی دار اونچی مسہریوں سے آراستہ تھا زمین میں قالین بچھا تھا مسہریوں پر صاف اُجلے پردے لٹک رہے تھے مشرقی رخ جدھر خاص میرا کمرہ. تھا ایک اور مستطیل کمرہ تھا جو ہر طرف پردوں سے گھرا ہوا تھا وہاں ایک لمبی سبز بانات کی میز بچھی تھی اور اس میں لکھنے پڑھنے کا سامان اور ٹیلیفون تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاص الخاص استعمال کے لئے ہے۔

بڑے ہال کی دیواروں پر افغانستان اور قندھار کے مختلف سلاطین

اور امراء کے فوٹو درباروں کے عکس، اور جشنوں کے مرقعے آویزاں تھے جن میں
امان اللہ خاں کے عہد کی تصویریں بھی تھیں۔

گندھار۔ قندھار بھی دنیا کے پرانے شہروں میں ہے، ہندوؤں کی پرانی کتاب
میں اس کو گندھار کہا گیا ہے، اس نام کا شہر جنوبی ہند میں بھی ہے، قندھا
غلزی پٹھانوں کا خاص مرکز ہے، اور پشتو زبان بولنے والی قوموں کی خاص
آبادی ہے۔

پٹھان اور راجپوت۔ میرا ایک پرانا نظریہ جواب تک مزید دلائل کا
تشنہ ہے، یہ ہے کہ ہندوستان کے راجپوت اور افغانستان کے پٹھان دونو
ایک قوم ہیں ان میں سے جو ہندوستان آکر ہندوؤں میں شامل ہوگیا اس
راجپوت نام پایا اور جو ادھر رہ گئے اور بعد کو اسلام سے مشرف ہوئے و
پٹھان کہے گئے یہاں کے مختلف کوہستانی دروں سے سلطان محمود اور
سلطان شہاب الدین کے پرچموں کے نیچے جو حملہ آور ہندوستان آئے
وہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا واقعہ نہ تھا بلکہ انھیں پرانی پٹھانی مسلسل آمد و
اور فوجی داخلوں میں سے ایک داخلہ تھا جو ہمیشہ ہندوستان میں ہوتے
رہتے تھے لیکن چونکہ یہ حملہ آور اب بودھ دھرم کے نہ تھے بلکہ مسلمان، اور ایک
قومی و منظم حکومت کے ماتحت تھے اس لئے قدیم سے آئے ہوئے راجپوتوں نے
ان کو قدم قدم پر روکا۔

مورخ مسعودی جس نے سنہ ۳۰۴ھ کے پس و پیش میں اطراف سندھ کا سفر کیا
تھا وہ قندھار کے ذکر میں لکھتا ہے۔ والقندھار یعرف ببلاد الرھبوط[۲]

جلد اول پیرس) یعنی قندھار رہبوط (؟) کے ملک کے نام سے معروف ہے"۔ میں رہبوط کو رجپوت (راجپوت) سمجھتا ہوں اس نے غالباً سندھ میں قندھار کے پٹھانوں کا نام "رجپوت سنا ہوگا"

قندھار سندھ کے خاتمہ پر ہے دوسری طرف اگر پہاڑ حائل نہ ہوں تو بنوں (صوبۂ سرحد) اور قندھار میں بہت کم مسافت رہ جائے اس کے بعد وادیٔ سندھ اور دریائے سندھ سامنے آجاتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قندھار کے حکمرانوں نے سندھ پر بارہا قبضہ کیا ہے۔

موجودہ قندھار۔ شہر قندھار گو پرانا شہر ہے مگر ہماری دلّی کی طرح وسیع و فراخ وادی کے گوشوں میں مختلف حکمرانوں اور فاتحوں کے عہد میں اپنی نئی نئی جگہ بدلتا رہا ہے، گویا یہ وہ کرے ہیں جو اپنی جگہ قائم بھی ہیں اور حرکتِ دوری بھی کر رہے ہیں سب سے اخیر زمانہ میں قندھار کی بربادی احمد شاہ درانی کے ہاتھوں ہوئی جس نے قندھار کے شہر اور قلعہ کو برباد کر کے نیا شہر آباد کیا، اور اب موجودہ قندھار درحقیقت یہی احمد شاہی قندھار ہے، احمد شاہ اور اس کے جانشینوں کا یہ دار الحکومت رہا، اس زمانہ میں افغانستان کی حکومت میں بلوچستان سندھ صوبۂ سرحد پنجاب کے کچھ اضلاع اور کشمیر داخل تھے، احمد شاہ نے ہندوستان پر جو فوج کشیاں کیں اور مرہٹوں کے خلاف جو فاتحانہ جنگ کی اُن کا مرکز یہی شہر قندھار تھا۔

موجودہ شہر قندھار کی تصویر آج بھی وہی ہے جو آج سے سو برس پیشتر تھی تاریخ احمد شاہ درانی کا مصنف سنہ ۱۲۶۴ھ میں اس کا نقشہ یہ کھینچتا ہے۔

"دگرد شہر پادشاہ ممدوح قلعۂ پختہ و جوہائے آب ریز زیر ہر بازار دو کانہا جاری و کنار جوہا سایۂ درختان توت و بازارش چار سو دور میانش گنبدے بلند بنا ساختہ" (ص ۴۵)

ارک شاہی میں قیام۔ ارک میں پہنچکر کچھ دیر آرام کر کے میں نے اور بعض دوسرے صاحبوں نے غسل سفر کیا کہ اب ہندوستان کی صرف ایک آخری منزل باقی ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ اتنے بڑے شاہی محل میں بھی مکان کے دو ضروری کمرے (غسلخانہ و بیت الخلا) اس کی حیثیت سے بہت ادنی اور معمولی، بلکہ تکلیف دہ تھے بات یہ ہے کہ قدیم تمدن میں غسلخانے رہنے کے مکانوں سے الگ حمام کی صورت میں مستقل بنائے جاتے تھے چنانچہ یہاں بھی نیچے حمام الگ موجود تھا جس میں ٹھنڈا اور گرم پانی الگ الگ اور نہانے کے دوسرے ضروری سامان موجود تھے بعض صاحبوں نے وہاں جاکر غسل کیا لیکن میں نے اسی ارک کے مختصر غسلخانہ میں حمام سے گرم پانی منگواکر غسل کیا یہاں کا موسم ملتان کے موسم کے قریب قریب تھا، نہانے میں بہت لطف آیا، اور کپڑے بھی اب ہندوستان کے موسم والے پہنے۔

پشتو تحریک۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کے بعد شہر کے کچھ ممتاز اصحاب ملنے آئے جن میں سے قابل ذکر دو صاحب ہیں، وزارت خارجیہ افغانستان کے نمایندہ متعینہ قندھار اور یہاں کی انجمن ادبی کے ناظم اور پشتو رسالہ طلوع افغان کے اڈیٹر عبدالحی خاں وزارت خارجیہ کے یہ نمایندے پہلے ٹرکی کی افغان سفارت میں کسی عہدہ پر رہ چکے ہیں اور اب یہاں متعین ہیں، عبدالحی خاں ہندوستان میں شاید سندھ اور بندر کراچی میں کچھ دنوں مقیم رہے ہیں، اردو خاصی بولتے ہیں، وہ اس تحریک کے کہ افغانوں کی قومی زبان پشتو کو ترقی دیکر یہاں کی تعلیمی و علمی و سرکاری زبان بنائی جائے علمبردار ہیں انھوں نے آنے کیساتھ ڈاکٹر اقبال سے

اسی موضوع پر گفتگو شروع کی ڈاکٹر صاحب نے جواب میں زبانوں کی نشو ونما اور ترقی پر اصولی بحث فرمائی اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور موثر ذریعہ ہے لیکن اگر اس تحریک سے قوم کے افراد میں اتحاد کے بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا ترانۂ جنگ ہے جس سے افغان قوم کو موجودہ منزل میں بہت کچھ بچنا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آج کل تنگ قومیت اور غلط نیشنلزم کا جو بھوت قوموں کے سروں پر سوار ہے اس کے اثر سے نوجوان افغانوں کے دل و دماغ کا بھی متاثر ہونا ضروری ہے، فارسی گو ایکہزار سال سے اس ملک کی علمی وادبی و سرکاری زبان ہے تاہم اس دیس کے عوام کی مادری زبان اب تک پشتو ہی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ اس پشتو تحریک کو آیندہ مزید تقویت پہنچے، اور ایک دن وہ افغانی قوم کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرے۔

گورنر قندھار اور دیگر عہدہ دار

ابھی ہم لوگ جنگجو افغانوں کی "زبانی جنگ" میں مصروف تھے کہ قندھار کے گورنر اپنے کشوری (سول) اور لشکری (ملٹری) اسٹاف کے ساتھ تشریف لے آئے وہ ملیریا بخار میں مبتلا تھے، اور بخار کے اترنے کے بعد بھی اس کا ضعف باقی تھا، اور اسی لئے شہر سے کئی میل دور کسی فرحت افزا مقام میں تھے، مگر صرف ہم لوگوں سے ملنے کی خاطر انھوں نے علالت اور ضعف کے باوجود یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی سردار موصوف نے ہم سب سے سلام و مصافحہ کے بعد اسٹاف کے ایک ایک عہدہ دار کا

تعارف کرایا یہاں کے بلدیہ (میونسپلٹی) کے صدر بھی اسٹاف کے ساتھ تھے دیر تک مختلف امور پر باتیں ہوا کیں، آخر چار بجے کے قریب ملنے والے مہمانوں نے رخصت چاہی، ہم لوگ بھی ساتھ ہی قندھار کی سیر کے لئے اٹھے۔

سردار موصوف نہایت متین سنجیدہ اور ملنسار معلوم ہوئے، یہ بھی موجودہ حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، خیال آتا ہے کہ شاہ نادر خاں مرحوم کے بھانجے ہیں ارک کے صدر دروازہ تک ہم لوگ ساتھ چلے، سردار موصوف قریب کے مقامات تک ہمراہ چلنا چاہتے تھے مگر ان کے ضعف کے سبب سے ان کو رخصت کیا اور وہ اپنی خوبصورت اور شاندار کار پر سوار ہو کر واپس گئے۔

خرقہ شریف کی زیارت گاہ اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ قریب تھا اس لئے ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے اور موٹروں کو مقبرہ کے دروازہ پر لیجانے کا حکم دیا گیا۔

خرقہ شریف ۔ ارک سے نکل کر سب سے پہلے خرقہ شریف کی عمارت ملتی ہے مشہور ہے کہ یہاں آنحضرت صلعم کا ملبوس اقدس ہے اس کی قدیم تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا احمد شاہ ابدالی کو یہ تبرک شاید بخارا سے ہاتھ آیا تھا۔ بڑے ادب و احترام سے اس کو اپنے دار السلطنت میں لایا اور قصر شاہی کے پاس ہی اس کے لئے سنہ ۱۱۸۲ھ میں ایک عمارت بنوائی عربی میں یہ تاریخ بالف ومأئة وثمانین و اثنین مرقوم ہے عمارت کی موجودہ شکل ایک بہت بڑے گنبد کی ہے جس کے نیچے ایک گول کوٹھری ہے جس کی چھت وہی گنبد ہے سامنے دروازہ سے گنبد کے اندر داخل ہوتے ہیں جس وقت ہم لوگ پہنچے ہیں اس دروازہ میں فرش بچھا تھا لیکن واپسی کے بعد ہم نے دیکھا کہ اسکو

سپاہیوں نے لپیٹ دیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرش خاص خاص موقعوں پر بچھتا ہے۔

موجودہ گنبد کی عمارت امیر حبیب اللہ خاں شہید مرحوم کی بنوائی ہوئی ہے دروازہ کے داہنے بائیں بلندی پر جلی خوشخط حروف میں لکھا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں سردار محمد عثمان خاں نائب سالار نائب الحکومت قندھار نے ۱۳۲۹ھ میں اس کو بنوایا دروازہ سے داخل ہو کر گنبد کے اندر قدم رکھا دیوار کی سطح خوشنما اور زرین نقش و نگار سے آراستہ تھی گنبد کے اوپر پورے دور میں کوئی خوشخط کتبہ تھا یہ گنبد خالی تھا اس کے مغربی رخ پر ایک اونچا چبوترہ تھا، اور اس کے پہلو سے اوپر چبوترہ پر چڑھنے کا زینہ تھا زینہ کے اوپر خوبصورت کٹہرہ تھا اس زینہ کی راہ سے ہم اوپر چڑھے وہاں ایک غلاف کے اندر وہ خرقہ شریف لپٹا تھا اوپر ایک شامیانہ تنا تھا سامنے خوشبو کے لئے بخوردان وغیرہ تھے درود و سلام کے ساتھ وہاں داخلہ ہوا اور پھر اسی احترام کے ساتھ واپسی ہوئی۔

اس قسم کے تبرکات کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ گو ان کی تاریخی حیثیت ہم پر واضح نہیں اور نہ اس نسبت کی صحت پر دلیلیں ظاہر ہیں، لیکن پھر بھی جمہور کثیر اس نسبت کی صحت کا قائل ہے اس بنا پر اس کے انکار کی بھی کوئی صاف قوی دلیل ہمارے پاس نہیں اس لئے اگر ہم نسبت نبوی کا پاس ادب کریں تو شاید یہ آئین محبت کے مطابق ہو تاہم ظاہر ہے کہ اس محبت کے آثار و کیفیات مشرکانہ رسوم اور مشرکانہ طریق ادب کی

صورت میں ظاہر نہ ہونے چاہئیں۔

احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ

یہ وہی احمد شاہ ابدالی درانی ہے جس کا نام ہندوستان کے آخری تاریخی اوراق میں بار بار آتا ہے، اور جس نے اپنے متواتر حملوں سے ہندوستان کی بدامنی کو دور کرنا چاہا اور سب سے آخری دفعہ آکر شمالی ہندوستان سے مرہٹہ تاخت و تاراج کا خاتمہ کر دیا۔

احمد شاہ کا خاندان صدوزئی قبیلہ سے ہے مشہور ہے کہ اس کے مورثوں میں سے ایک بزرگ کا نام ترین تھا اس نے خواجہ ابو احمد ابدال چشتی سے مرید ہو کر ابدال لقب پایا اور اسی نسبت سے احمد شاہ ابدالی کہلایا، ترین ابدالی کی اولاد میں سے ایک کا نام صدو تھا جس سے صدوزئی قبیلہ کا وجود ہوا، صدو کے ایک لڑکے کا نام خضر تھا، خانوادۂ چشت کی ارادت و بیعت نے اس خاندان میں بزرگی کی شان پیدا کی خضر نے اپنی دینداری اور تقدس کی بنا پر خواجہ خضر کا لقب پایا، اور افغانوں کی ارادت و عقیدت نے اس کو مرکزی حیثیت عطا کی احمد شاہ اسی مقدس دادا کا خوش قسمت پوتا تھا، نادر شاہ کے بعد افغانوں نے احمد شاہ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور قندھار اس کا دارالسلطنت قرار پایا اس وقت اس بادشاہ کے دائرہ حکومت میں افغانستان کے علاوہ کشمیر صوبہ سرحد پنجاب اور سندھ کے علاقے داخل تھے جن کو اس کے بعد کے جانشینوں نے رفتہ رفتہ اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔

سلطان احمد شاہ ابدالی دیندار انصاف پسند اور پرجوش مجاہد تھا اور

یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہے کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے بڑا کوئی دوسرا ہیرو نہیں تیئیس۲۳ برس کی سلطنت کے بعد ۱۱۸۶ھ میں وفات پائی اور قندھار میں ارک شاہی کے پاس دفن ہوا اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے تیمور شاہ نے تخت شاہی پر قدم رکھا اور اپنے باپ کی قبر پر یہ عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا افغانوں میں اس مقبرہ کا اس قدر ادب و احترام تھا کہ خونی مجرم بھی اگر بھاگ کر اس میں پناہ لیتا تو امان پاتا۔

مقبرہ اینٹ اور چونہ کا بنا ہے، اوپر بہت بڑا ہشت پہل گنبد ہے جس کے نیچے بادشاہ کی قبر ہے گنبد کی بیرونی دیواروں پر چینی کا کام ہے جو اب خراب ہو چکا ہے گنبد کے اندر کی سطح طلائی اور رنگ آمیزی کے نقش و نگار سے آراستہ ہے گنبد کے اندر زمین پر کوئی فرش نہ تھا گنبد کے اوپر جہاں دیواریں ختم ہوتی ہیں چاروں طرف خوشخط جلی حروف میں حسب ذیل اشعار لکھے ہوئے ہیں

شاہِ والا جاہ احمد شاہ درانی کہ بود — در قوانینِ امورِ سلطنت کسریٰ منش
از نہیبِ قہرمانِ سطوتش در عہدِ او — شیر آہو را بشیرِ خویش دادے پرورش
می رسید از ہر طرف در گوشِ بدخواہانِ او — از زبانِ خنجرش ہر دم ہزاراں سرزنش
چوں رواں شد جانبِ دار البقا تاریخ بود — سال ہجری یک ہزار و یکصد و ہشتاد و شش

مقبرہ کے اندر قدم رکھنے کے ساتھ اس بادشاہ کشورستاں کی وہ تصویر سامنے آ گئی جو ہندوستان کی انگریزی تاریخوں میں بنی ہوئی نظر آتی ہے، اس کے کارناموں کی عظمت نے اپنے زائرین کو باادب بنا دیا جو چیز مٹی کے ڈھیر کے نیچے تھی، وہ چند بے جان ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں مگر اس کی زندگی کا ایک ایک

حرف آبِ حیات کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر ثبت ہے۔

قرآنِ پاک کا شاہی نسخہ

مقبرہ میں سلطان کے سرہانے بلندی پر اس کا وہ قرآن رکھا تھا جو خاص اس کی تلاوت کا تھا مقبرہ کے خادم نے اس قرآن کو جزدان سے نکال کر ہمارے سامنے رکھا، یہ چوب خط مترجم ومحشی قلمی قرآن تھا جس کی تیاری خاص اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی تھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کی اخیر عمر میں اس کی پیری اور ضعفِ بصارت کی بنا پر موٹے حرفوں میں لکھوایا گیا تاکہ بادشاہ سہولت کے ساتھ اس کو پڑھ سکے یہ نسخہ دو ہاتھ کے قریب لمبا ہے، خط نہایت عمدہ اور بہت جلی ہے نیچے فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر بخط نستعلیق فارسی کی تفسیریں ہیں اور آخر میں فارسی نظم میں ایک فالنامہ ہے اور سب سے آخر میں جن لوگوں نے اس نسخہ کو بادشاہ کے لئے تیار کیا تھا ان کے نام ہیں عبارت کا اقتباس یہ ہے۔

> ”……سلطان احمد شاہ بادشاہ غازی درانی خلد اللہ ملکہ دہم شہر ربیع الثانی سنہ ۱۱۷۹ھ باہتمام بندۂ درگاہ اضعف عباد اللہ علی اکبر خان اوتوکری حافظ عبدالوہاب متن نوشت و محمد ہاشم و محمد تقی و عبدالصبور تفاسیر نوشت و محمد یوسف ترجمہ نوشت و بہ کار صحافی عبدالحکیم صحاف صورتِ اتمام پذیرفت“

میں نے کہا یہ قرآن کا وہ نسخہ ہے جو اس تیغ آزما کشور کشا فاتح ہند حکمراں بادشاہ کے دل پر حکمرانی کرتا تھا۔

عبارتِ بالا میں نسخہ مذکور کی تیاری کی جو تاریخ (سنہ ۱۱۷۹ھ) درج ہے اس سے

علوم ہوتا ہے کہ یہ شاہِ مغفور کی وفات سے آٹھ برس پہلے تیار ہوا تھا۔

رغنداب۔ مقبرہ سے نکل کر سڑک پر آئے تو موٹریں کھڑی تھیں ہم لوگ دو ٹروں پر سوار ہوئے، مامور صاحب وزارت خارجہ جو اب تک ہمارے ساتھ ے آیندہ کی سیر میں بھی ہمارے ہمراہ ہوئے قندھار کا سب سے خوبصورت اور لش طبعی منظر کا نام ارغنداب ہے مقبرہ سے نکل کر ہم اس کے دیکھنے کو روانہ ہوئے شہر کی چار دیواری سے باہر بھی ہر طرف عمدہ سڑکیں تھیں سامنے پہاڑی کی ندی نظر آتی تھی نیچے ایک نہایت وسیع میدان تھا، مامور صاحب (افغانستان موجودہ سلطنتی اصطلاح میں "مامور" کے معنی ماتحت افسر کے ہیں) نے بتایا کہ پہلے پرانا ندھار یہیں آباد تھا مگر اس وقت یہاں اس میدان میں گذشتہ آبادی کا کوئی شان موجود نہیں۔

اس میدان کو طے کر کے ہم مذکورۂ بالا پہاڑی کے قریب پہنچے اس پر یک نہایت عمدہ ڈھلوان سڑک بنی ہوئی تھی موٹروں نے آہستہ آہستہ بلندی پر ڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ہم پہاڑی پر چڑھ گئے اوپر تنگ راستہ سے ہوتے وئے ایک ایسے بلند لیکن تنگ تر مقام پر پہنچ گئے جہاں سے موٹروں کا آگے ڑھنا ناممکن تھا یہاں سے اتر کر پیدل چلے اور فوراً ایک کشادہ مقام پر آ گئے بس کے پچاس ساٹھ فیٹ نیچے زمین کی سطح تھی یہ عجیب و غریب منظر تھا ندھار کی سب سے بڑی بلندی پر ہم اس وقت کھڑے تھے نیچے میدان میں ریائے ارغنداب بہہ رہا تھا اور اس کے بعد تھوڑے فاصلہ پر و اور ندیاں بہہ رہی تھیں، الغرض نیچے تین تین ندیاں یا فطری نہریں آہستہ آہستہ

مصروفِ خرام تھیں اور ان ندیوں یا نہروں کے کناروں کے برابر برابر تیس میل تک متصل انار اور دوسرے میوؤں کے باغ در باغ کا سلسلہ نظر کے سامنے تھا ایسا دلچسپ فطری منظر میری آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا جدھر نظر اٹھتی تھی جنّٰت تجری من تحتہا الانہار کا سماں دکھتی تھی۔

بابا کا مزار۔ اللہ والوں کی کیا بات ہے؟ یہ مخلوق کے ازدحام سے بھاگ کر جب کسی گمنام گوشہ کو ڈھونڈھتے تھے تو عموماً ان کی نگاہِ انتخاب قدرت کے کسی نہ کسی سادہ مگر دلچسپ منظر پر جا کر پڑتی تھی، اکثر بزرگوں کی چلہ کشی اور عبادت کی جگہیں اسی قسم کے مقامات ہیں پورٹ سوڈان کو اب جا کر انگریزوں نے آباد کیا اور بندرگاہ بنایا ہے، مگر حیرت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ نے خدا جانے اس سے کتنا زمانہ پہلے اس کو اپنے عبادت خانہ اور مدفن کے لئے پسند کیا چنانچہ بحر احمر کے آفریقی ساحل پر پورٹ سوڈان کے قریب ان کا مزار ہے، ارغنداب کا یہ دلچسپ نظارہ کب کسی نظارۂ قدرت کے طالب سے بچ سکتا تھا ایک بزرگ نے جو بابا ولی کہلاتے ہیں اس مقام کو پسند کیا ان کا مزار اس بلندی پر واقع ہے اور اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کا کھلا دالان ہے سال میں ایک دفعہ یہاں میلہ لگتا ہے اور دنبے قربانی ہوتے ہیں شہر کے خوش مذاق دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے یہاں اکثر آتے ہیں اور کھانا پکاتے اور کھاتے ہیں۔

یہاں سے واپسی میں مامور صاحب نے سڑک سے ایک اونچی پہاڑی دکھائی جس کی قدرتی شکل ایسی تھی جیسے معلوم ہوتا ہو کہ ایک بہت بڑا ہاتھی سینکڑوں گز لمبا سامنے بیٹھا ہے۔

بجلی گھر۔ دریائے ارغنداب کی روانی سے علاوہ باغوں کی سیرابی کے موجودہ حکومت نے جدید سائنٹیفک فائدہ اٹھانا چاہا ہے چنانچہ ان دریاؤں کے بہاؤ سے جو بجلی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے اسی کے قریب ایک بجلی گھر بنایا ہے بجلی کے چند ماہرین اس میں کام کرتے ہیں بجلی کے ستون سڑکوں پر قائم کئے جا چکے ہیں اور تار بھی پھیلائے جا چکے ہیں مگر ابھی تک بمبئی کے محاورہ میں کارخانہ "چالو" نہیں ہوا ہے امید ہے کہ اتنے عرصہ میں یہ کارخانہ شہر کے گھروں اور سڑکوں کو پرنور بنا چکا ہوگا۔

چہل زینہ۔ اس پہاڑی سے اتر کر ہم قندھار کے باہر کی دوسری سمت میں چلے اور ایک پہاڑی کے پاس پہنچے شہنشاہ بابر نے اس پہاڑی کے اوپر اپنے ہندی فتوحات کا کتبہ لگایا ہے اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ہم موٹروں سے اترے حکومت نے اس پہاڑی تک سڑک بنا دی ہے، دامن سے پہاڑی تک پتھر کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں ہمراہیوں میں سے میرے اور پروفیسر ہادی صاحب کے سوا کسی اور نے اوپر چڑھنے کا شوق نہیں کیا کہنے کو تو یہ چالیس زینے ہیں مگر در اصل تعداد میں چھیالیس ہیں، حکومت نے زینہ کے دونوں طرف لوہے کے کٹہرے لگا دیئے ہیں، تاکہ چڑھنا اترنا آسان اور محفوظ ہو یہ سیڑھیاں پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں جو زیادہ صفائی کے ساتھ نہیں بنی ہیں ہم نے ہمت کر کے ان سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا گو اب تھوڑی محنت سے بھی دم پھول کر سینہ میں درد محسوس ہونے لگتا ہے تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور اوپر تک چڑھ گیا، اوپر

پہاڑ کی سطح کو کھود کر مسجد میں امام کے سامنے والی محراب کی طرح ایک محراب بنائی گئی ہے جس کے بیچ میں ایک طاق ہے اور اس میں شہنشاہ بابر کے حکم سے جلی خط میں ہندوستان کے ان شہروں کے نام بہ ترتیب وقوع جغرافی کندہ کئے گئے ہیں، جن کو اس نے بزور بازو فتح کیا تھا، اور اوپر بادشاہ کا نام لکھا ہے پورب کے شہروں میں سے پٹنہ، حاجی پور، ترہت، سہسرام سے لیکر لکھنؤ اور وہاں سے لاہور تک کے شہروں کے نام ہیں، دن آخر ہو چکا تھا اس لئے ان ناموں کو نقل نہ کر سکا واپسی کی جلدی تھی

مجوزہ جدید شہر قندھار۔ موجودہ شہر سے باہر اور چہل زینہ سے قریب ہم نے بعض نئی سڑکیں، روشیں اور ایک نئے شہر کی طرح ڈالنے کے نشان دیکھے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ امیر امان اللہ خاں یہاں جدید اصول پر نئے شہر قندھار کی بنیاد ڈالنی چاہتے تھے مگر زمانہ نے وفا نہ کی۔

فوجی میدان۔ ارغنداب سے واپسی میں اور چہل زینہ کو آتے ہوئے ایک میدان ملا تھا جس میں افغانی فوج، ورزشی کرتبوں، فوجی کھیلوں اور قومی رقص میں مصروف نظر آئی۔

شہر کی کیفیت۔ اس شہر کی سڑکیں عموماً اچھی نظر آئیں، بیرون شہر کی سڑکیں بھی صاف اور ہموار بنی ہوئی تھیں اور سب سے بڑھ کر اس کی سرسبزی و شادابی کا منظر ہے، ہر طرف میدان ہی ہے ساتھ ہی ساتھ نہروں کی کیفیت یہ ہے کہ جدھر نگاہ اٹھائے پانی کی ہلکی سی لکیر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، عموماً سڑک کے ساتھ اس کے پہلو بہ پہلو پتلی سی نہریں ہر طرف رواں ہیں، باہر سے

آنے والی سڑک اور شاہ بازار کی سڑک میں یہ کیفیت خاص طور سے نمایاں ہے۔

اسلامی شہر کا منظر۔ چہل زینہ سے واپسی میں مغرب کا وقت ہو گیا تھا اور اسلامیت کا یہ کس درجہ پر اثر منظر تھا کہ ہر راہرو، ہر مسافر، ہر دکان دار، جس کو جہاں موقع تھا اس نہر رواں پر بیٹھ کر وضو کر رہا تھا اور چادر بچھا بچھا کر اگر جماعت کی صورت نہ تھی تو تنہا کھڑا رو بقبلہ نماز ادا کر رہا تھا، بیچ بیچ میں ایسے چبوترے بھی ملے جن پر نماز باجماعت ادا ہو رہی تھی آباد مسجدیں بھی ملیں، بازار پر گزر ہوا تو دیکھا کہ دکاندار سے لے کر خریدار تک نہر پہ وضو کر رہا تھا، یا مصروف نماز تھا کوئی اپنی دوکان ہی پر اور کوئی دکان سے نیچے کپڑا بچھا کر کھڑا تھا، یہ روح پرور نظارہ قندھار کے سوا اس ملک میں مجھکو اور کہیں نظر نہیں آیا۔

شہر کی روشنی۔ شاہ بازار کی سڑک اب کھل گئی تھی اسی راہ سے واپس ہو کر ارک پہنچا اور نماز مغرب ادا کی اب رات کی آمد آمد تھی تمام بازاروں میں پوری روشنی تھی۔ یہاں دکانیں جلد بند ہوتی ہیں شاہ بازار کی دکانیں البتہ شام کے بعد بھی کھلی رہتی ہیں، اور ان میں روشنی معلوم ہوتی ہے ارک شاہی کے اس رخ سے جو شاہ بازار کی طرف ہے دیر تک کھڑا رہا، سڑکوں پر روشنی کے بلند ہنڈے آویزاں تھے جن سے سارا بازار روشن تھا۔

باغ عمومی میں بینڈ۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ارک کا جو رخ شاہ بازار کی طرف ہے اس میں ارک اور بازار کے بیچ میں ایک باغ عمومی یعنی پبلک گارڈن ہے اس وقت اس باغ عمومی میں "جنت نگاہ کے ساتھ ساتھ "فردوس گوش" کا بھی سامان تھا

یعنی بینڈ ماسٹر کی نگرانی میں افغانی فوجی باجہ سڑک پر باقاعدہ دور کرکے نغمہ سرائی میں مشغول تھا بیچ کی سڑک سے نمودار ہو کر ارک کے نیچے تک پہنچ کر بازو کی سڑک پر گھوم جاتا تھا اور وہاں سے آہستہ آہستہ چلکر پھر بیچ کی سڑک پر پہنچ جاتا تھا کہیں کہیں مقررہ مقامات میں تھوڑی تھوڑی دیر کھڑا بھی ہو جاتا تھا، یہ نغمہ سرائی ایک گھنٹہ تک جاری رہی ہوگی اس کے بعد وہ اپنا مقررہ وقت ختم کرکے ارک کے سامنے آداب بجالا کر رخصت ہوگیا۔

یہ متمدن ملکوں کے شہروں کی پوری نقل تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ انتظام یہاں کی مینوسپلٹی کی طرف سے ہے، ہر روز شام کو یہاں آکر فوجی بینڈ بجاتا ہے۔

راس مسعود صاحب کا شبینہ سفر

ہمارے رفقاء میں سے سید راس مسعود صاحب کو واپسی کی سخت جلدی تھی وہ چاہتے تھے کہ آج ہی شب کو یہاں سے رخصت ہو کر صبح کو چمن پہنچیں اور چمن سے موٹر ہی چل کر دوپہر کی گاڑی کوئیٹہ میں پکڑیں اور وہاں سے ریل پر سوار ہو کر علی گڈھ روانہ ہو جائیں لیکن مشکل یہ تھی کہ سید صاحب کی سواری کی موٹر خراب ہو چکی تھی، اور کسی دوسری موٹر کے انتظام میں وقت تھی، دوسری دقت یہ تھی کہ جب تک انگریزی قونصل خانہ قندھار کے فارم پر موٹر کے تمام ضروری حالات وکیفیات لکھ کر اس سے اجازت نہ لے لی جائے موٹر چل نہیں سکتی تھی۔

قندھار کا برطانی قونصل خانہ۔ قندھار میں انگریزوں کا ایک قونصل خانہ بھی ہے جو ارک شاہی سے قریب ملا ہوا ہے۔ آج کل یہاں کے قونصل ہمارے

دوست سید غلام بھیک صاحب نیرنگ کے حقیقی بھائی خاں بہادر سید صدیق حسن صاحب ہیں موصوف عصر کے وقت ملنے بھی آئے تھے ڈاکٹر اقبال سے ان کی پرانی ملاقات اور گویا ہموطنی تھی دبلا پتلا بدن، ادھیڑ عمر کی کچی پکی داڑھی سر پر پنجابی صافہ اور کوٹ ملنے میں خلیق، ملنسار اور متواضع وہ پہلے سواحل عرب کی ریاستوں میں سے شاید بحرین میں انگریزی قونصل تھے اب قندھار میں ہیں ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب جو مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں اُن سے سید موصوف کی خاص عزیز داری ہے اس بنا پر سید راس مسعود صاحب نے اپنے سفر کے مشکلات کے حل کرنے میں مدد چاہی اُنھوں نے اس کا حل یہ پیدا کیا کہ خاص اپنی کار جس کے مذکورہ بالا قانونی مراحل پہلے سے طے تھے اور جس کا شوفر بھی راستہ کے جزئیات سے پورا واقف تھا راس مسعود صاحب کے حوالہ کر دی اُن کے اسباب کے لے جانے کے لئے افغانی لاری تیار کر دی گئی تھی بیچارہ سرور خاں گویا اور مامور صاحب اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے سید صاحب کے اس شبینہ سفر کی سخت مخالفت کر رہے تھے مگر انھوں نے کسی طرح نہ مانا مجبوراً با دلِ ناخواستہ آخر رخصت کیا چند مسلح سپاہی ساتھ کر دئے راستہ میں قلعہ نو کے محافظین کو ٹیلیفون کر دیا کہ جو موٹر اور لاری اس وقت جا رہی ہے ان کی مزاحمت نہ کریں اور آگے بڑھنے دیں اور فوجی چوکیوں کے ہر افسر کو ٹیلیفون سے حکم دیا گیا کہ جب جس کی سرحد سے یہ موٹر گزرے وہ قندھار کے اعلیٰ دفتر کو اطلاع دے اس انتظام کے ساتھ سید صاحب مع پروفیسر ہادی حسن کے قندھار سے رخصت ہوئے ۱۲ بجے شب کو وہ یہاں سے چلے تھے اور صبح کو معلوم ہوا کہ طلوع آفتاب سے کچھ پہلے

وہ افغانی سرحد سے بخیر و خوبی گزر کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔

شب کا قیام۔ باقی رفقائنے رات قندھار ہی میں بسر کی رات کو پوری ٹھنڈک تھی سب نے کھلے کمروں کے اندر مسہری کے پردوں میں چادریں اوڑھ کر آرام کیا میں صبح کو حسب معمول اٹھا اور صبح کے دوگانہ کے بعد ارک سے اُتر کر پیادہ اور تنہا شہر کی طرف رخ کیا۔

سڑکوں کی سیر۔ میں ارک کے زینہ سے اُتر کر باغ عمومی میں آیا۔ دونوں طرف پتلی ہی نہریں بہہ رہی تھیں ابھی باغ کا آغاز ہے سڑکیں بھی بن رہی تھیں ارک کے سامنے کی دکانوں کی تعمیر بھی جو جدید طرز پر ہو رہی تھی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کنارہ کی سڑک سے ایک ایک دکان پر غور کی نظر ڈالتا ہوا شاہ بازار کی طرف چلا ہر دکان پر نہایت اہتمام سے فارسی زبان و خط میں سائن بورڈ لٹکے ہوئے تھے سب کے تختے سیاہ اور حروف سپید تھے ہر دکان کے سائن بورڈ پر اُس کے مالک کا نام مع پیشہ یا جنس دکان کے اظہار کے لکھا ہوا تھا مثلاً یعقوب علی خاں کتاب والا' احمد خاں گھی والا' سردار خاں شکر والا۔

اردو کی عالمگیری۔ اردو تو جلال آباد' کابل اور غزنین ہر جگہ ملی مگر قندھار کی ایک خاص امتیازی شان یہ دیکھی کہ دکانوں پر سائن بورڈ کے اوپر ہر جگہ پیشہ یا جنس دکان کے اظہار میں اردو لفظوں کا اظہار تھا اور والا کا لفظ جو خالص اردو ہے ہر دکان کے سائن بورڈ پر درج تھا مثلاً فلاں خاں کتاب والا' گھی والا' شکر والا' والا کی اس کثرت استعمال کو دیکھ کر بمبئی یاد آگئی جہاں بوٹلی والا (بوتل والا) اور اسٹیشن والا تک سنائی دیتا ہے۔

دکانیں سویرے کھلتی ہیں ۔ یہاں جس طرح دکانیں سویر بند اور سویرے کھلتی بھی ہیں یا طلوع آفتاب کے ساتھ دکانیں کھل رہی تھیں کھانے کی دکانیں جابجا تھیں اور یہ بالکل ہی طرح کی تھیں جس طرح لکھنؤ اور دلّی میں نانبائیوں کی دکانیں ہیں یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا تھا کہ دکانوں پر خاں صاحب بیٹھے ہوئے کہیں ہلدی و دھنیا بیچ رہے ہیں کہیں غلہ تول رہے ہیں کہیں کپڑے ناپ رہے ہیں۔

میں اس سڑک میں اس گنبد تک گیا جس کو حیدرآباد کے چار مینار سے تمثیل دے چکا ہوں راستہ میں سڑک پر جابجا دودھ دہی بالائی بیچنے والے بیٹھے تھے یہاں کا جماؤ دہی خاص طور پر نہایت عمدہ ہوتا ہے مٹی کے چھوٹے چھوٹے آبخوروں میں وہ جما ہوا بازار میں فروخت ہوتا ہے، دودھ دہی والے یہ آبخورے لئے جگہ جگہ بیٹھے تھے خصوصاً گنبد کے نیچے کی چھت میں ان دہی بیچنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

دکانوں کی کیفیت ۔ یہ دکانیں مسقف تھیں یہاں گنبد نما یا ماہی پشت کچی چھتوں کا رواج ہے، دکانوں میں عموماً صرف ایک کمرہ یا کوٹھری نظر آئی سامنے بازار کے رخ دروازے کھلے ہوئے سامان کی حیثیت سے دکانیں بہت معمولی تھیں کپڑوں کی دکانوں میں بھی سوتی کپڑے تھے اور بہت معمولی تھے چھینٹ کے کپڑے اکثر چھپیلے تھے دکانیں گو صاف تھیں مگر چونکہ اعلیٰ معیار کے عمدہ سامان و اسباب سے خالی تھیں اس لئے نمائش میں وہ رونق نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

شاہ بازار کی مسجد ۔ شاہ بازار کے بیچ میں ایک مسجد ملی میں اس میں داخل ہوا

مسجد معمولی تھی مگر منبر ایک خاص پتھر کا عمدہ تھا معلوم ہوا کہ یہ پرانے زمانہ کی شاہی تعمیر ہے۔

پتھر کی صنعت۔ قندھار کی خاص چیز پتھر کی صنعت کاریاں ہیں یہاں ایک پتھر ہوتا ہے جس کا نام سنگ شاہِ مقصود ہے یہ سپید، زرد اور سبز تین رنگوں کا ہوتا ہے سب سے سستا سپید، پھر زرد، اور گراں اور کمیاب سبز ہے اس پتھر کی پہلے عموماً تسبیحیں بنتی تھیں اور اب اس زمانہ میں حال کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی بنتی ہیں مثلاً کاغذ دبانے کا پتھر، سگریٹ کی ڈبیہ، سگریٹ کا پائپ، میوہ دان اور شمعدان وغیرہ۔

دکاندار۔ سید راس مسعود صاحب اپنی عزیز خواتین کے لئے تحفہ کے طور پر اس پتھر کی چند تسبیحیں خریدنی چاہتے تھے مامور صاحب نے رات کے وقت چند دکانداروں کو سامان لے کر ارک میں بلوایا، ایک ایک بکس میں ہر شخص اپنا سامان لے کر آیا، اور بات چیت شروع کی زبان فارسی تھی، اللہ اکبر! ہر طرح کی قسم وقرار اور اظہارِ ایمانداری) کے باوجود قیمت کے بتانے اور مول تول میں اتنی فضول گوئی ہوئی کہ بیگانہ آدمی کبھی صحیح قیمت پر چیز خرید ہی نہیں سکتا سو پچاس روپیہ قیمت کہہ کر مول شروع ہوا، اور دس بارہ روپیہ پر تمام ہوا سبز تسبیح کے دانے پندرہ روپیے میں ملے ان کے ساتھ تسبیحوں کے گوتھنے کا سامان بھی ساتھ رہتا ہے اسی وقت تسبیحیں دھاگے میں پرو کر خریدار کے حوالے کیں

مدرسے اور علمی ادارے۔ اتنی جلدی میں یہاں کا کوئی مدرسہ یا علمی ادارہ نہیں سکا کابل کی طرح یہاں بھی ایک انجمن ادبی ہے اور اس کے چند علم دوست

ارکان ہیں انجمن کے پاس مختصر سا کتب خانہ بھی ہے اس انجمن میں فارسی کے بجائے پشتو زبان کو اہمیت حاصل ہے انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ پشتو رسالہ بھی نکلتا ہے ایک مختصر عجائب خانہ ہے جس کو میوزیم جدید کہتے ہیں عربی کا ایک مدرسہ ہے جس کا نام مدرسۂ محمدیہ ہے نئی طرز کے دو سرکاری اسکول ہیں ایک کا نام مکتب شعلۂ ماہ اور دوسرے کا نام مکتب توپخانہ ہے ان دونوں اسکولوں میں سے ہر ایک میں پانچسو طالب علم ہوں گے، ایک دارالمساکین بھی ہے جس میں محتاجوں کو حکومت کی طرف سے کھانا ملتا ہے خود اہل شہر اور محلہ والوں کی طرف سے بھی چند مدرسے ہیں جن میں محلہ کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔

قندھار کے پھل اور میوے۔ قندھار کی تجارت کا سب سے بڑا سامان پھل اور میوے ہیں یوں تو اور بھی پھل اور میوے ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ شہرت یہاں کے اناروں کو حاصل ہے قندھاری انار جو ہندوستان آتے ہیں وہ تو مہینوں میں سوکھ کر خشک ہو جاتے ہیں، وہاں کا ایک تازہ انار آدھ سیر سے کم نہ ہوتا ہوگا اور اس قدر ان میں عرق ہوتا ہے کہ آدھا گلاس عرق ان سے بخوبی نکلتا ہے۔ البتہ ان میں کسی قدر چاشنی ضرور ہوتی ہے اس لئے انار کے دانوں پر ذرا سا نمک چھڑک کر کھاتے ہیں اور اس ترکیب سے ان کا ایک خاص مزہ ہو جاتا ہے، ہر روز قندھار سے چمن اور کوئٹہ کو ان میووں اور پھلوں کی پچیس تیس لاریاں آتی جاتی ہیں، ان کے لئے وہاں خاص قسم کی ٹوکریاں بنتی ہیں اور ایک قسم کی لمبی لمبی گھاس چاروں طرف سے بھر کر بیچ میں پھل اور میوے رکھتے ہیں کہ راستہ میں وہ دبنے اور چور ہونے سے محفوظ رہیں۔

قلعہ جدید و چمن ۲ر نومبر ۱۹۳۳ء

بلدیۂ قندھار کی دعوت سے معذوری قندھار کے بعض معززین کا خیال تھا کہ یہاں کی بلدیہ (میونسپلٹی) کی طرف سے ہم کو دعوت چائے دی جائے اس کے لئے ضرورت تھی کہ کم از کم ایک روز اور ٹھہریں لیکن قربِ وطن کے شوق نے صرف ایک دعوت چائے کی خاطر ایک روز کی قربانی گوارہ نہ کی سرور خاں گویا نے بہت اصرار کیا مگر معذرت ہی کرنی پڑی اور یہی طے پایا کہ آج ۲ر نومبر کی صبح کو قندھار سے روانگی ہوگی

قندھار کے باہر۔ قندھار کے باہر بھی بعض عمارتیں اور شاہی و عمومی باغ ہیں جن میں سے بعض خاص طور سے مشہور ہیں مگر وقت کی تنگی کے سبب سے ان کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

دفاتر۔ سرکاری دفاتر کی عمارتوں میں بھی جانے کا اتفاق نہ ہوا سنا ہے کہ دفاتر کی عمارتیں اچھی ہیں مگر ابھی ان کی تنظیم موجودہ متمدن نظام پر نہیں ہوئی ہے ایک قاضی ہر قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے،

ایک عجیب بات یہ ہے کہ فصلِ مقدمات کا طریقہ جس قدر ابتدائی ہوتا ہے اسی قدر مقدمات کم اور اپنی طبعی صورت میں ہوتے ہیں اور جس قدر ان کی ترتیب و تنظیم اور قواعد و قوانین کی پرپیچ راہیں اختیار کیجاتی ہیں، اسی قدر نزاعات اور پیچیدہ مقدمات کی کثرت ہوتی جاتی ہے، ہندوستان میں اس کا مشاہدہ ہر انسان کرسکتا ہے۔

پروانۂ راہداری کی تصدیق۔ جن لوگوں کے پاس ہندوستان سے

افغانستان جانے کے پاسپورٹ ہوں ضرورت ہے کہ واپسی کے وقت واپسی کی اجازت اور تصدیق افغانی و برطانی دفاتر میں کرالیں، ہم نے آسانی کے خیال سے کابل ہی میں اس مرحلہ کو طے کرلیا تھا چنانچہ پہلے افغانی دفتر نے اور پھر برطانی سفارت نے اس کی تصدیق کردی۔

"برائے رفتن ہندوستان از راہِ قلعہ جدید قندھار"

اس کے بعد "برٹش لیگیشن کابل" نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی جو لوگ کابل سے یہ تصدیق نامہ اپنے ساتھ نہ لائیں ان کے لئے ضرورت ہے کہ وہ قندھار میں برٹش کونسل اور حاکم قندھار کے دفتر سے اپنے پاسپورٹوں پر یہ تصدیق کرالیں، ورنہ اُن کو افغانستان سے نکلنے اور ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملے گی۔

قندھار سے روانگی۔ آٹھ بجے صبح کو چائے اور ناشتہ سے فرصت کرکے قندھار سے روانگی کا سامان ہونے لگا سواری میں وہی موٹر تھی جس پر کابل سے اب تک میں اور ڈاکٹر صاحب بیٹھ کر آئے تھے یہ اچھی خاصی، وسیع اور نہایت آرام دہ موٹر تھی کہہ چکا ہوں کہ افغانستان سے ہندوستان آنے کیلئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ برطانوی کونسل کے ایک فارم بہ حسب ذیل امور کی خانہ پُری کرکے وہاں پیش کرنا ہوتا ہے موٹر کا نمبر، موٹر کے کارخانے کا نام مدت استعمال موجودہ کیفیت موٹر کے مالک کا نام شوفر کا نام اور اس کی سند اجازت وغیرہ جس موٹر پر ہم سوار ہو کر آئے تھے وہ ہندوستان پہلے بھی آچکا تھا اس لیے اس کا مذکورہ بالا فارم برطانوی کونسل کا پہلے ہی پاس

کیا ہوا موجود تھا اس لئے کوئی وقت پیش نہیں آئی اسی طرح جس لاری پر سامان آیا تھا وہ بھی مذکورۂ بالا مرحلہ کو پہلے ہی ختم کر چکی تھی کہتے ہیں کہ یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے تاکہ راستہ کی خرابی سے کوئی افتاد پیش نہ آئے۔

روانگی کے وقت گورنر صاحب قندھار کی طرف سے ایک خریطہ میں کچھ خشک میوے اور قندھاری انار کے دو ٹوکرے تحفہ میں آئے یہ ٹوکرے لاری میں لٹکا کر باندھ دئیے گئے تاکہ وہ دبنے سے خراب نہ ہوں۔

۹ بجے کے قریب ارکِ شاہی سے ہماری موٹر نے حرکت کی لاری پر اسباب کے علاوہ دستہ جو کابل سے ساتھ آیا تھا سوار تھا سرور خاں گویا جو اب تک رفیقِ سفر ہیں ان کی تکلیف کے خیال سے ہم لوگ چاہتے تھے کہ وہ قندھار ہی میں ٹھہر جائیں اور ہمارے ساتھ آگے نہ جائیں لیکن ان کی مہمان نوازی نے یہ گوارا نہ کیا اور شاید کہ شاہی حکم بھی یہی ہو بہرحال وہ بھی ساتھ روانہ ہوئے

راستہ۔ قندھار سے تھوڑی دور تک تو سڑک اچھی ملی پل بھی تھے مگر جوں جوں آگے بڑھتے گئے راستہ کی خرابی تکلیف دہ ہوتی گئی اکثر پل ٹوٹے تھے موٹروں کو ایسے مقامات پر پل سے نیچے اتر کر پھر بلندی پر چڑھنا پڑتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہادر افغانوں کے ساتھ ان کی موٹریں بھی بہادر ہوتی ہیں جو ان خوفناک راستوں کو اس طرح نڈر ہو کر طے کرتی ہیں افغان شوفروں کی بہادری کی بھی داد دینی چاہئے جو اس دشوار گزار راستہ کو اس خوبی سے طے کرتے جاتے ہیں

تختۂ پل۔ قندھار سے چند میل نکل جانے کے بعد ایک منزل آئی جس کا نام تختہ پل تھا شاید اس نام کی اصلیت یہ ہو کہ یہاں تختوں کا کوئی پل بنا ہو

بہرحال ایک چنگی کی سرکاری عمارت ہے جو بدستور خام ہے یہاں قندھار سے آنے جانے والوں کے اسباب کی دیکھ بھال ہوتی ہے اور قابل محصول اشیاء پر چنگی وصول کی جاتی ہے ہم لوگوں کے ساتھ تحفہ کے چند قالین تھے، ان پر کابل ہی سے سرکاری طور پر ایک دھیلے کے برابر مہر کیا ہوا چپٹا سیسہ تیلے تار سے باندھ دیا گیا تھا، یہ شاید کابل کے چنگی خانہ کا نشان ہو یا ان سامانوں پر یہ لگایا جاتا ہو جن کو حکومت چنگی کے محصول سے مستثنیٰ کر دیتی ہو۔

قاعدہ کے مطابق ہماری موٹریں بھی یہاں آکر رکیں اور چنگی کے عمال نے سرسری طور سے دیکھ بھال کر ان کو آگے بڑھنے کی اجازت دی۔

صحرائے سندھ و بلوچستان۔ اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے راستہ خراب سے خراب تر آتا جاتا تھا بلکہ یوں کہئے کہ سرے سے راستہ ہی نہ تھا۔ ایک لق و دق ریگستان تھا جس میں ہر موٹر اور لاری اپنا راستہ آپ تلاش کر لیتی ہے موٹروں اور لاریوں کی آمد و رفت سے ہر جگہ ریگ میں گڑھے پڑ پڑ جاتے تھے اور پھر ہوا کے جھونکے ان کو تھوڑی دیر میں بھر دیتے تھے آدھے آدھے پہیئے ریگ میں دھنس دھنس جاتے تھے ایک موٹر یا لاری کے گزرنے سے ایک لیکھ جب خراب ہو جاتی ہے دوسرا موٹر اور لاری والا اپنی موٹر اور لاری کو اس سے بچا کر دوسری راہ اختیار کر لیتا تھا اس طرح ہر روز ان سواریوں کی آمد و رفت سے بیسیوں نشان پڑ پڑ کر مٹ مٹ جاتے ہیں جہاں کہیں ذرا مٹی سخت بھی تھی تو وہ ان بھاری سواریوں سے چور ہو کر سرمہ ہو گئی تھی مگر با ایں ہمہ اسی ریت کے دلدل سے ہو کر بیسیوں لاریاں

آجا رہی تھیں، دیکھنے والوں کو سب سے زیادہ ہولناک سماں یہ نظر آتا تھا کہ کسی لاری کے ایک طرف کے پہیئے تو ریت میں دھنسے ہیں اور دوسری طرف کے پہیئے زمین کی اصلی سطح پر ہیں اس سے لاری ایک طرف اتنی جھکی معلوم ہوتی تھی کہ ہم کو ڈر لگتا تھا کہ یہ کہیں الٹ نہ جائے ان سکنڈ ہینڈ پرانی لاریوں والوں کی بیکسی پر کس قدر افسوس ہوتا تھا جو ہم کو جگہ جگہ بیکار پڑی نظر آتی تھیں اور ان کے شوفر اُن کی درستی کے لئے اس بے نام و نشان صحرا میں کئی کئی گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔

اس راستے کے بیچ بیچ میں پہاڑ بہت کم آتے ہیں بلکہ گویا نہیں ہیں اسلئے راستہ اور ریت کی دشواری جو کچھ ہو مگر درّہ خیبر والے راستہ کی طرح یہ خوفناک اور خطرناک نہیں۔

یہ صحرائے ریگ افغانستان و ہندوستان بلکہ ایشیائے وسطیٰ اور ہندوستان کا سب سے پرانا اور تاریخی راستہ ہے تاریخ کو جب سے علم ہے یہ راستہ تجارتی کاروانوں اور قافلوں کی آمد و رفت سے معمور نظر آتا ہے ہندوستان کے بہت سے فاتح اور کشور کشا اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے تیمور اسی راستہ سے ہندوستان آیا، ہمایون اسی راستہ سے ہندوستان سے نکل کر ایران میں داخل ہوا تھا بلکہ عجب نہیں کہ محمد بن قاسم ثقفی اسی طرف سے سندھ میں داخل ہوا ہو۔

یہ صحرائے ریگ قندھار کے حدود کے بعد سے شروع ہو کر بلوچستان و سندھ کے علاقوں سے گذر کر بحر ہند کے سواحل تک یونہی چلا جاتا ہے

اس صحرا اور ہندوستان کے درمیان ایک پہاڑی سلسلہ دور سے برابر برابر ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی میں وہ مشہور درۂ بولان ملتا ہے جس سے ادھر کے شمشیر آزما فاتح وادی سندھ میں اُتر کر ہندوستان میں داخل ہوتے رہے ہیں، احمد شاہ ابدالی بھی کئی دفعہ اس درہ سے گزر کر ہندوستان آیا تھا۔

قلعہ جدید۔ قندھار سے آٹھ بجے کے قریب چل کر ۱۲ بجے کے بعد ہم قلعہ جدید پہنچے یہ اس سمت میں افغانستان کی آخری سرحد ہے یہاں ایک پرانا قلعہ نظر آیا جو اب بالکل شکستہ ہے، دوسرا یہ نیا قلعہ ہے جس میں افغانی سرحدی چوکی اور چنگی خانہ اور پروانۂ راہداری کی دیکھ بھال کے دفاتر ہیں افغانستان کے عام دستور کے مطابق یہ قلعے بھی خام مٹی کے تھے اُن کی چھتیں بھی مٹی کی کچی تھیں، اکثر چھوٹی چھتیں گنبد نما تھیں قلعہ کے اطراف میں سپاہیوں کے بارک تھے۔

ہندوستان کی آمد و رفت کے سبب سے یہاں لاریوں اور مسافروں کی اچھی خاصی چہل پہل تھی کھانے اور میوؤں کی دکانیں بھی نظر آتی تھیں، باورچی کی دکان جس کو دیسی ہوٹل کہئے وہ بھی موجود تھی۔

ہماری موٹر جیسے ہی آکر رکی قلعہ کے سپاہیوں نے صف بستہ ہوکر مہمانوں کے اعزاز کا فرض ادا کیا، مامور صاحب جو یہاں کے افسر تھے زینہ سے اتر کر نیچے تشریف لائے اور مہمانوں کا استقبال کیا یہ نوجوان خوش سلیقہ انگریزی لباس میں ملبوس سر پر ہیٹ لگائے اور اسی کے ساتھ داہنے ہاتھ میں سنگِ شاہ مقصود کے بڑے بڑے زرد دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔

تسبیح کا فیشن۔ افغانستان میں اس قسم کی تسبیحوں کا ہاتھ میں رکھنا ایک فیشن ہے، یہ عموماً بڑے بڑے تینتیس ۳۳ دانوں کی تسبیح ہوتی ہے جس کو ارباب منصب اور امراء ہاتھوں میں لئے رہتے ہیں کبھی ان کے دانوں کو پھراتے ہیں اور کبھی اُن سے کھیلتے ہیں۔

قلعہ جدید میں قیام۔ مامور صاحب ہم لوگوں کو ساتھ لے کر قلعہ کے بالائی حصہ میں گئے چھت پر ایک سائبان اور چند کمرے تھے جن میں سے ایک ملاقات یا کھانے کا کمرہ تھا اور دوسرے میں مامور صاحب کا دفتر تھا۔

کھانے کا سامان اور باورچی اور خدام کابل سے برابر ساتھ آرہے تھے، جہاں جہاں قیام ہوتا باورچی کھانا پکاتے اور خدام قرینہ سے میز پر چن کر کھانا کھلاتے تھے، یہاں بھی انھوں نے جلدی جلدی کھانے کا سامان کیا اور انھیں کمروں میں سے ایک میں میز پر کھانا لگانے کا انتظام کیا ظہر کا وقت آچکا تھا ہم نے ظہر کی نماز ادا کی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک چبوترے پر جو خاص نماز کے لئے تھا سپاہی اپنی پوری وردیوں میں آتے اور فریضۂ ظہر ادا کرتے ہم نے اپنے ساتھ کے سپاہیوں کو بھی اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ انگریزی وردی کے تنگ کپڑے ہمارے ہندوستانی جنٹلمینوں کی طرح ان افغان سپاہیوں کے لئے ترک نماز کا عذر نہیں بنے ہیں،

یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پنجاب اور سرحد کے دیہاتوں کی طرح یہاں بھی کوٹھے کی بالائی چھت بیت الخلا اور استنجا خانے کے کام میں آتی ہے۔

یہاں ہمارے راہداری کے پروانوں کی دوبارہ تصدیق کی گئی اور ان پر "تحت نمبر ۱۲۵ ۱۰ر۸ر۱۲ار موقع خروج سرحد ملاحظہ شد" لکھکر مہر لگا دی گئی۔

جبتک یہ دفتری کارروائی ہوتی رہی ہم نے کھانا کھایا کھانے سے فارغ ہوکر ہم ہندوستان کی سرحد کی طرف آگے بڑھنے کو تیار ہوئے۔

وداعی منظر۔ اب ہم افغانستان کی آخری سرحد میں تھے، اور اپنے میزبانوں سے شاید ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے تھے ایک اسلامی حکومت کے روح افزا مناظر کی سیر ابھی دل بھر کرنے بھی نہ پائے تھے کہ موسم بہار آخر ہوگیا قلعہ کے تمام افسر اور عملہ نے رخصتانہ ہاتھ ملائے رفیق سفر سرور خاں گویا جو اتنے دنوں تک جلوت و خلوت میں ساتھ رہے تھے ہم کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ہم اُن کو تک رہے تھے۔ ع

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

بیچارہ گویا بلبل قفس کی طرح ابھی تک افغانستان سے باہر نہیں گیا ہے اور باہر کی دنیا کو صرف کتابوں کی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ اس سرحد کے پاس پہنچ کر پھڑک پھڑک کر رہ گیا، زبانِ حال یہ کہہ رہی تھی۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم   فروغِ تجلّی بسوزد پرم

سب سے زیادہ مؤثر منظر اپنے ساتھ کے افغانی دستہ کے سپاہیوں سے رخصت ہونے کا تھا یہ موٹر کے سامنے ایستادہ تھے چلتے وقت اُنھوں نے فوجی قاعدہ سے رخصتانہ سلام کیا مگر ہیں بیچارہ کہ نہ "کشوری" (سویلین) تھا

نہ لشکری (ملٹری) فوجی قواعد سے بے پروا ہو کر ایک ایک سپاہی سے بغل گیر ہو کر اور مصافحہ کر کے رخصت ہوا اور زبان سے صرف اسی قدر کہا کہ

"افغانستان کا قلعہ تم ہو"

افغانستان کا چہکتا بلبل گویا اس وقت خاموش تھا، اور مصافحہ و معانقہ کے بعد باہم مکاتبت و مراسلت کے وعدہ پر ہماری یہ چند روزہ ملاقات ختم ہو گئی موٹروں نے آگے کو حرکت کی اور چند منٹ کے اندر افغانستان کی سرحد کو پھاند کر انگریزی علاقہ میں داخل ہو گئیں۔

چمن۔ ہندوستان کی پہلی سرحدی آبادی کا نام چمن ہے دیکھنے میں تو یہاں ریگ اور خشک پہاڑوں کے سوا کچھ اور نہیں مگر یہاں کی معنوی خشکی کو لفظی تری سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کسی زمانہ میں چمن بھی مملکت افغانستان کی ایک کیاری تھی مگر باغبان و صیاد کی باہمی کشمکش میں یہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

افغانی علاقہ جونہی ختم ہوا وہ سیاہ تختہ کھڑا نظر آیا جس پر ہندوستان کی سرحد کا اعلان اور پروانہ راہداری کے بغیر اس سے آگے بڑھنے کی ممانعت لکھی تھی، سرحد کو عبور کیا تو چمن کا سواد سامنے آگیا انگریزی کارخانوں کے ستون اور چمنیاں اور بلند مکانوں کی چھتیں دکھائی دینے لگیں یہ اصل میں تمام تر فوجی چھاؤنی ہے ہر طرف فوجی آبادی کے نشان نظر آتے تھے کہیں بارکیں تھیں، کہیں گھوڑ دوڑ کا میدان کہیں کھیل اور ورزش کی فیلڈ۔

آبادی آئی تو شاید افغانی مامور تجارت کے ذریعہ جس کو ہمارے آنے کی اطلاع تھی یا صبح کو سید راس مسعود صاحب کی زبانی لوگوں کو ہمارے اس وقت

آنے کی خبر ہو گئی تھی، چنانچہ شہر کے دروازہ ہی پر مسلمانوں نے استقبال کیا اور ایک ریسٹوران میں لاکر بٹھایا اور اس بات کی تمہید کی کہ ہم آج اپنا سفر ملتوی کرکے رات کو یہاں کے مسلمانوں کے سامنے کچھ تقریریں کریں مگر ایک تو اس دور دراز سفر کے تکان سے چور تھے دوسرے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ کر حبّ وطن کی "آتش شوق تیز تر" ہو چکی تھی، اس لئے معذرت کی مگر ان کا اصرار برابر قائم رہا اور اس کے لئے مختلف تدبیریں کرتے رہے

یہاں پہنچ کر پہلا کام یہ کرنا پڑتا ہے کہ یہاں کے پولیس افسر کے دستخط پاسپورٹ پر کرائے جاتے ہیں، اس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں، پاسپورٹ دستخط کے لئے بھیجے گئے، لیکن اس کی واپسی میں دیر پر دیر ہوتی گئی، اور ہماری الجھن بڑھتی گئی اور یہ شبہہ ہوا کہ شاید ہمارے روکنے والے دوستوں کی یہ تدبیر نہ ہو تاکہ آج کا جانا کسی طرح ملتوی ہو جائے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم خود افسر صاحب کے دولتخانہ پر پہنچ جائیں الغرض ہم جیسے ان کے دروازہ تک پہنچے وہ باہر نکل آئے اور دستخط کرکے پاسپورٹ واپس کئے۔

ریسٹوران (چائے خانہ) میں مختلف خیال کے مسلمان جمع ہو گئے تھے جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے مجھ سے اور ڈاکٹر اقبال صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے مگر سب کے سب افغانستان کی ترقی و خیرخواہی کے جذبات سے معمور تھے ڈاکٹر صاحب کے اسکول کے زمانہ کے ایک ہندو کلاس فیلو جو یہاں ڈاکٹر تھے ملنے آئے اور ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا اثنائے گفتگو میں افغانستان کے متعلق ایک ایسا لغو فقرہ ان کی زبان سے نکلا جس سے

مسلمانوں کو سخت تکلیف ہوئی یہاں یہ سن کر افسوس ہوا کہ ہندو بھائیوں کو موجودہ حکومت افغانستان سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ اس کو "متعصب مسلمان" جانتے ہیں اور امیر امان اللہ خاں سے اس لئے ہمدردی ہے کہ وہ ان کو اسلام کا "باغی" تصور کرتے تھے، حالانکہ ان کے یہ دونوں خیال غلط ہیں۔

یہاں حکومت افغانستان کا ایک مامورِ تجارت رہتا ہے، افغانی قونصل خانۂ دہلی کے کاتب (کلرک) کو جو ہمارے ساتھ تھا مامور صاحب سے مصارفِ سفر کے لئے رقم لینی تھی مامور صاحب کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے بھی کافی دیر لگائی، پے درپے قاصدوں کے بھیجنے کے بعد وہ آخر آئے تو اس شان سے آئے کہ آگے آگے وہ خود اور پیچھے پیچھے ان کے نوجوان فیشن ایبل جنٹلمین صاحبزادے، رسم تعارف کے بعد کاتب صاحب سے اور اُن سے دیر تک ردّ و بدل ہوتا رہا۔

ان تمام جھمیلوں کے بعد ہم چمن سے آگے بڑھے سڑک اتنی عمدہ تھی کہ لامحالہ انگریزی حکومت کی تعریف کرنی پڑتی ہے ہماری اسلامی و مشرقی سلطنتیں اصلاحات کے لئے بیشک بے قرار ہیں مگر اس زمانہ میں اصلاح کے معنی روپئے کے ہیں۔ جب تک ان کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہوگی وہ اصلاحات کے جاری کرنے پر قدرت نہیں رکھتیں ہر مسافر کو جو افغانستان کی سڑکوں سے نکل کر ہندوستان کی سڑکوں پر آتا ہوگا بداہتہً بغیر کسی دلیل و حجت کے مشرقی سلطنتوں کی پستی اور انگریزی حکومت کی برتری کا خیال آجاتا ہوگا، اس لئے ہماری مشرقی سلطنتوں کا فرض ہے کہ وہ ان ظاہری نقائص کیطرف پوری توجہ دیں

ایک تو ہندوستان کی سڑکیں مقابلتہً یوں بھی اچھی ہیں پھر انگریزی فوجی اغراض نے چمن کے شہر کو نہیں تو چمن کی سڑکوں کو تو بیشک چمن بنا دیا ہے سڑکیں اتنی صاف ستھری ہموار اور چکنی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پہیئے خود بخود پھسلتے جا رہے ہیں

چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے مگر ہم لوگوں نے ایک دن بچانے کی خاطر چمن سے کوئٹہ تک ریل پر سفر کرنے کے بجائے موٹروں پر سفر کیا۔ چمن سے ریل صرف ایک وقت صبح کو چلتی ہے اگر اس پر سفر کرتے تو ضرور ہوتا کہ آج رات پھر یہاں ٹھہریں اور صبح کو روانہ ہوں اور کوئٹہ سے ڈاک گاڑی ۱۱ بجے دن کو چلتی تھی تو اگر آج شام تک کوئٹہ پہنچ جائیں تو رات بھر وہاں آرام کر کے ۱۱ بجے ڈاک سے کل ہی روانہ ہو سکیں گے یہ تجویز قندھار ہی سے طے شدہ تھی کہ چمن سے کوئٹہ تک سفر انھیں موٹروں پر ہو گا اور کوئٹہ سے ریل پر سوار ہونگے

میرا اندازہ ہے کہ ۴ بجے شام کے قریب ہم چمن سے روانہ ہوئے چمن اور کوئٹہ کے درمیان غالباً ساٹھ ستر میل کی مسافت ہے ریل اس مسافت کو پانچ گھنٹوں میں طے کرتی ہے صبح آٹھ بجے چل کر ایک بجے دن کو وہاں پہنچتی ہے موٹر میں بھی چار گھنٹوں سے زیادہ لگے جس کی وجہ بلندیوں کی چڑھائی اور ایک طویل پر پیچ پہاڑی راستہ کا عبور کرنا تھا چمن سے تھوڑی دور نکلنے کے بعد ایک پل آیا اس پر ایک بھاری زنجیر کی روک پڑی ہوئی تھی جس کے اٹھائے بغیر اِس پار سے اُس پار جانا ناممکن تھا متعین پہرہ دار نے چمن کے پولیس افسر کی تصدیق دیکھ کر زنجیر ہٹائی اور موٹریں آگے بڑھیں۔

کوئٹہ اور ملتان

کوہستانی سڑک۔ شام کا وقت تھا، اور ایک بڑی چڑھائی باقی تھی، اور یہ وہی طویل کوہستانی سلسلہ تھا جو افغانستان کو ہندوستان سے الگ کرتا ہے چمن اور کوئٹہ کے بیچ میں یہ ایک سدِ سکندر ہے جس کے عبور کرنے کے بعد کوئٹہ سامنے آجاتا ہے ریل اس پہاڑ کے نیچے سے سرنگ سے ہو کر گزرتی ہے اور موٹر اور لاری اور پیادہ مسافر اس پہاڑ کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور اس کو عبور کرکے اِس پار سے اُس پار ہوتے ہیں۔ پہاڑ پر چڑھائی کے لئے حکومت انگریزی نے پہاڑ کو کاٹ کر اور جگہ جگہ نشیب و فراز کو ہموار کرکے موٹروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے نہایت عمدہ سڑک تیار کی ہے قدم قدم پر موڑ آتے تھے اِدھر اُدھر بغل میں غار اور خندقیں ملتی جاتی تھیں شوفر کی ذراسی غلطی موت کا پیغام تھی مشکل راستوں پر انگریزی میں ہدایتیں لکھی تھیں۔

موٹر نے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ کر بیچ پہاڑ کے نشیب و فراز میں قدم رکھا عمدہ سڑک ہونے کے باعث پہیئے خود بخود پھسلے جاتے تھے اور وہ بڑی تیز سے راستہ قطع کرتی جاتی تھی خوش قسمتی سے کوئی دوسری موٹر مخالف سمت سے آئی ہوئی نہیں ملی اس لئے ہمارا شوفر اس ڈر سے اپنی موٹر بے تکان بھگا رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے وہ اس دشوار راہ کے خطروں سے باہر ہو جائے اس جلدی پر بھی شام ہو ہی گئی۔

روحانیات کا ذکر۔ عجیب اتفاق کہ راستہ تو یہ خطرناک درپیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے

پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی تھی اس عہد کے مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے آغازِ زندگی اور طالب علمانہ عہد کا ذکر چھیڑا پھر اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کیا کہ وہ خود ایک صاحبدل صوفی تھے اور دیندار علماء کی صحبت میں رہتے تھے اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حسیاتِ خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی وہ خود اُن کے والد ماجد کی ذاتِ بابرکات تھی ۔

اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد کے ایک قصہ کے اثنا میں اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بیحد اثر کیا فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا ایک صبح کو نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمھارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلعم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزہ نہیں ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے فرمایا کہ جب بی اے پاس کرو گے تو بتاؤں گا کچھ دنوں کے بعد جب اُنھوں نے بی اے پاس کر لیا تو اس خوشخبری کے معاوضہ میں اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی مرحوم نے اُن کو کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے

ملت محمدیؐ کی خدمت بجا لاتا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم اُن کے نغمہ سے سرشار و مست تھا۔ اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا، اور بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس عیسیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔

پہاڑی راستہ اب ختم ہوا اور میدان کا منظر نمایاں ہو رہا تھا مغرب کے قریب پہاڑ کے نشیب میں میدان آیا، آبادی کا کچھ نشان آیا اور سیدھی سڑک دکھائی دی اس سڑک پر آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا شہر ملا جس کے چھوٹے سے دورویہ بازار سے ہو کر سڑک نکلی ہے یہاں پہنچنے کے ساتھ موٹر روک دی گئی اور پولیس کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ایک رجسٹر پیش کیا جس پر غلام رسول خاں بیرسٹر (رفیق ڈاکٹر اقبال) نے دستخط کر دیئے جس کے بعد ہم آگے بڑھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ہر گزرنے والے کا نام درج رجسٹر ہوتا ہے۔

مغرب اور عشا کے بیچ میں جب تاریکی خوب پھیل رہی تھی بجلی کے چراغوں کی روشنی دور سے قطار در قطار نظر آنے لگی یہ کوئٹہ تھا اس تاریکی میں روشنی کا یہ منظر آسمان پر جھلملاتے ہوئے ستاروں کا سماں دکھا رہا تھا رفتہ رفتہ شہر قریب آیا، افغانی سفارت متعینہ دہلی کے نمایندہ نے ہمارے لئے یہاں کے ڈاک بنگلہ میں تین کمرے لے لئے تھے وہیں آکر قیام ہوا۔

تمام بستر و سامان لاری پر تھا اور وہ پیچھے رہ گئی تھی کوئٹہ میں اس وقت خاصی سردی تھی ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آتشدان روشن تھا اور ہم سب

اس کے گرد بیٹھے لاری کی آمد کا انتظار کر رہے تھے رات کی تاریکی اور سردی بڑھتی جاتی تھی اور لاری کا انتظار سخت سوہان روح کا باعث ہو رہا تھا، سب سے بڑے ڈر کی چیز یہ تھی کہ رات کی تاریکی میں کہیں لاری کو کوئی صدمہ نہ پہنچا ہو اس لئے ہم سب بہت پریشان تھے وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ پریشانی بھی بڑھتی گئی بالآخر دس بجے رات کے قریب لاری آئی اور معلوم ہوا کہ راستہ بخیریت گذرا کابل میں جو بستر اور بکس اور سوٹ کیس لاری پر رکھے گئے تھے ان کو آج پہلی دفعہ یہ موقع ملا کہ زمین پہ قدم رکھیں ان دشوار گزار راستوں کے ہچکولوں اور آتار چڑھاؤ کے جھٹکوں میں ان کی پوری درگت بنگئی چمڑے کے بکسوں کے اکثر کونے اور گوشے تو لاری کی رگڑ سے کٹ کٹ گئے تھے بستر بندوں کے کپڑے اس سفر کے مشکلات کی تاب نہ لا کر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر، وزن دار ہو گئے تھے مگر

شکر للہ کہ جنازہ بمنزل برسید

ہم نے کھانا ڈاک بنگلہ کے ڈائننگ روم میں کھایا کھانا انگریزی تھا مگر بہت معمولی اور بہت خراب پکا تھا ناچار پاؤ روٹی اور مکھن پر گزر کیا،

لاری پہنچنے کی خوشی ہم سب کو بہت ہوئی تھی، میں آتشدان کے پاس بیٹھا تھا لاری پہنچنے کی خوشی میں دفعتہً ٹھنڈک میں باہر نکل آیا اس کا اثر یہ ہوا کہ رات بھر بخار اور خفیف لرزہ میں مبتلا رہا صبح کو اٹھا تو طبیعت ہلکی تھی نماز پڑھی اور تھوڑی دیر کے بعد چائے پی کر پیادہ تنہا شہر دیکھنے کو نکلا اور اسٹیشن تک گیا۔

کوئٹہ۔ یہ برطانی بلوچستان کا صدر مقام ہے، اور سمندر کی سطح سے پانچہزار قدم بلند ہے کہتے ہیں کہ اس کا پرانا نام کوٹ کوٹ تھا اور ایک معمولی گاؤں سا تھا ۱۸۷۶ء میں سر رابرٹ سینڈیمین نے جب اس پر قبضہ کیا اور قلعہ تعمیر کیا جس کا نام ان کے نام پر فورٹ سینڈیمین ہے تو اس کا نام زبانوں پر کوئٹہ ہوگیا یہ ہندوستان کا سب سے بڑا جنوبی فوجی مرکز ہے یہاں سے ایک ریلوے لائن ایران کی سرحد دُزداب تک جاتی ہے دوسری سڑک قندھار کو جدھر سے ہم آئے تھے اور تیسری ریلوے لائن کراچی کو جو یہاں سے پانچ سو میل دور ہے اور چوتھی لائن شکار پور ہو کر بھاولپور اور ملتان سے لاہور کو جاتی ہے۔

یہ ایشیائے وسطیٰ، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی تجارت اور بیوپار کی مرکزی منڈی ہے، میوے بکثرت اور تازہ بتازہ ملتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ خشک میوؤں کی قیمت ہندوستان کے دوسرے شہروں سے کم نہیں مجھے صرف بادام کا تجربہ ہے دوستوں نے کہا کابل میں خریدنا بے کار ہے انھیں داموں میں کوئٹہ میں ملیں گے مگر یہ خیال غلط نکلا کابل میں بادام کابلی بارہ آنے فی سیر تھے پشاور میں ہندوستانی بارہ آنے فی سیر دام ہیں لیکن کوئٹہ میں ڈیڑھ روپیہ سیر ملے انگور اور انار البتہ سستے ہیں۔

مکانات زیادہ تر بنگلہ نما ہیں چھتیں لکڑی اور کھپروں کی ہیں سڑکیں کشادہ اور صاف ہیں آبادی میں مسلمانوں کا حصہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

رات کو آتے ہوئے کوئٹہ کو رواروی میں دیکھا صبح اُٹھ کر سیدھی سڑک پر

چلا تو اسٹیشن پہنچ گیا سڑک کے دونوں طرف بنگلے تھے اسٹیشن بہت بڑا اور بہت پر رونق تھا چھاونی کی وجہ سے ہر طرف فوجی چہل پہل معلوم ہوتی تھی قلی پشتو، بلوچی، سندھی، فارسی، اردو سب ہی زبانیں بولتے تھے،

اسٹیشن سے واپس پھرا تو ایک صاحب نے جو کلاہ و دستار اور کوٹ اور شلوار میں ملبوس تھے پیچھے سے مولنا مولنا کہہ کر مجھے ٹھہرانا چاہا میں ٹھہر گیا وہ دوڑتے ہوئے پاس آئے، اور پہلے اپنی اس حرکت کی معافی مانگی پھر پاسپورٹ دیکھنا چاہا، اور روانگی کا وقت پوچھا اور سفر کی سمت دریافت کی اور ارشاد کیا کہ میں خفیہ پولیس میں انسپکٹر ہوں اور اپنی خدمت اور ادائے فرض سے مجبور ہوں اور یہ بھی کہا کہ آج صبح سر راس مسعود صاحب اسی بات پر خفا ہو گئے میں نے کہا آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں خوشی سے دریافت کریں چنانچہ ان کے تمام مطلوبہ معلومات فراہم کر دیئے اور ان کے سوالات کے جوابات دیدئیے، وہ شکریہ ادا کر کے واپس گئے۔

راہ میں ملتان پڑتا تھا میرے ایک عزیز (مولوی سید عبد الباری صاحب) مدت سے ملتان میں رہتے ہیں ریلوے دفتر میں ملازم ہیں سالہا سال سے ان کا تقاضہ تھا کہ میں کبھی ملتان آؤں یہ موقع بے منت ہاتھ آیا اُن کو تار دیا کہ کل دوپہر کو میل سے آتا ہوں۔

۱۰ بجے کے قریب ہم لوگ ڈاک بنگلہ سے چل کر اسٹیشن آئے انسپکٹر صاحب موصوف موجود تھے انھوں نے اپنی مہربانی سے اسباب تُلوانے اور ٹکٹ لینے میں مدد فرمائی ۱۱ بجے کے قریب گاڑی آئی اور ہم لوگ آرام سے سوار ہو کر

روانہ ہوئے راستہ بہت پر لطف تھا جگہ جگہ پہاڑیاں مل رہی تھیں کچھ دور کے بعد صاف ریگستان آگیا اور گرد و غبار اور ریت سے واسطہ پڑا پشاور سے کلکتہ تک براہ پٹنہ جو راستہ ہے جس قدر وہ معمور ہے اسی قدر یہ راستہ ویرانہ تھا گھنٹوں کے بعد بھی کوئی آبادی نہیں آتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس کو سرسبزی اور شادابی سے محروم ہی رکھا ہے اب سندھ کا ریگستان شروع ہو گیا تھا کہیں کہیں جو اسٹیشن آجاتے تھے انھیں میں کچھ آبادی کا سراغ ملتا تھا تاہم یہ خوشی ہو رہی تھی کہ عمر میں پہلی دفعہ اس راہ سے گذر رہا ہوں جس پر فاتحین اسلام کے کاروان صدیوں سے چلتے رہے تھے بھاولپور۔ ریل اسی طرح دن بھر اور رات بھر چلتی رہی مشہور مقامات میں سے جیکب آباد اور شکارپور گزرے دوسرے روز کچھ دن چڑھے بھاولپور آیا چونکہ نوابان بھاولپور اور خصوصاً جدہ ماجدہ صاحبہ مرحومہ نواب صاحب بھاولپور نے ندوۃ العلماء کی ہمیشہ مالی امداد فرمائی اس لئے میں نے بڑے شوق کی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اس سے ایک اُنس سا معلوم ہوا اس ریاست کے فرمانروا عباسی نسل سے ہیں احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں اُنھوں نے سندھ کے اس حصہ پر حکومت قائم کی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت پنجاب کے عہد میں ان کو زیر کرنا چاہا ۱۸۱۶ء میں انسے ستر ہزار کا نذرانہ بھی بجبر حاصل کیا مگر یہ بہت جلد اس سے آزاد ہو کر انگریزوں سے ملحق ہو گئے موجودہ عہد میں جامعہ عباسیہ ریاست مذکور کی علمی ترقیوں کی سب سے بڑی دلیل ہے سندھ کا مشہور شہر اُچ اسی ریاست کے اندر واقع ہے ناصر الدین قباچہ کے زمانہ میں یہاں مدرسہ فیروزی واقع تھا جس میں طبقات ناصری کے مصنف قاضی منہاج سراج مدرس مقرر ہوئے تھے۔

ملتان۔ ۱۲ بجے کے قریب ملتان آیا سید عبدالباری صاحب کیپٹن محمد عظیم صاحب اگزیکیٹو افسر ملتان چھاؤنی، سید عبدالغنی صاحب بی اے وائس پریسیڈنٹ کنٹونمنٹ بورڈ سید میر حسن صاحب رئیس ملتان وغیرہ موجود تھے اسٹیشن سے سیدھے سید عبدالباری صاحب کے قیامگاہ پر آیا احباب آتے رہے اور ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ان میں سب سے دلچسپ شخصیت سید میر حسن صاحب رئیس ملتان چھاؤنی کی تھی ساٹھ ستر کے درمیان عمر ہوگی آنکھوں سے معذور ہو چکے ہیں، تاہم کتابوں اور رسالوں کا شوق باقی ہے وہ خود اب نہیں پڑھ سکتے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتے ہیں، سر سید کے خیالات سے بہت متاثر ہیں مگر اب امید ہے کہ اس ردِ عمل سے وہ متاثر ہو رہے ہیں جو سر سید مرحوم کی فطرت پسندی کے باب میں اب عمل میں آرہا ہے

علاوہ دوسرے دوستوں کے یہاں کی جامع مسجد کے خطیب و امام مولنا سید اشفاق علی صاحب فاضل دیوبند سے مل کر خوشی ہوئی یہ روشن ضمیر بھی ہیں اور روشن خیال بھی، ملتان کے زمانۂ قیام میں جو تین روز تک ممتد رہا موصوف کی صحبت سے بڑی دلچسپی رہی۔

ہمارے نوجوان دوست پروفیسر اکبر صاحب منیر جن سے مدت سے مراسلت تھی اور جو ایران کی سیاحت سے ہمارے لئے جدید فارسی شاعری کا تحفہ لائے تھے جن کا دیوان ماہِ نو چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور جن کی نظموں کے ذریعہ سے معارف کے ناظرین بھی ان سے آشنا ہیں وہ خوش قسمتی سے آج کل یہیں کے گورنمنٹ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے ان سے پہلے لاہور میں ملاقات ہو چکی تھی یہاں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی منیر صاحب

جدید فارسی اور اردو کے نازک خیال شاعر ہیں اور اخلاقاً نہایت متواضع اور خاکسار ہیں۔

ملتان ہماری اسلامی تاریخ کا نہایت قدیم اور نہایت مشہور شہر ہے یہی وہ شہر ہے جسکو مسلمانوں نے محمد بن قاسم ثقفی کے زیر سرکردگی پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب فتح کیا تو اس وقت سے لیکر سکھوں کے عہد تک یہ ہمیشہ اسلامی حکومت کا ایک اہم مرکز رہا، غزنویوں کے فتوحات سے صدیوں پہلے یہاں مسلمان آباد تھے اور ان کی اسلامی حکومت قائم تھی، چوتھی صدی کے اواخر میں یہاں کی عربی حکومت مصر کے فاطمیہ کے زیر سایہ اسماعیلیت میں بدل چکی تھی اور اسماعیلی امرا یہاں حکومت کرتے تھے انھیں کا نام ہندوستان کی تاریخوں میں ملاحدہ اور باطنیہ آتا ہے محمود غزنوی نے اس کو باطنیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی سلطنت میں ملحق کیا غزنویوں کے ضعف کے بعد پھر اسماعیلیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور آخر شہاب الدین غوری نے ان کے ہاتھوں سے دوبارہ اس کو لے لیا۔

غزنویوں کی آمد سے پہلے تک یہ شہر عربوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا غزنویوں کی فتح سے اس کا تعلق مصر کے بجائے غزنین سے ہو گیا، تاہم یہ ہر دور میں اسلامی علوم و فنون کا بڑا مرکز رہا، علامہ بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ نے بھی یہاں قیام کیا تھا چشتیوں کو چھوڑ کر تصوف کا دوسرا خانوادہ جو ہندوستان میں سب سے زیادہ پھیلا وہ سہروردی تھا جس کے بانی حضرت شیخ ابو النجیب شہاب الدین سہروردی المتوفی سنہ ۵۶۳ھ تھے سہروردی خاندان کے فیوض و برکات کا سرچشمہ یہی شہر ہے شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا ملتانی (ولادت سنہ ۵۷۸ھ ۔ وفات سنہ ۶۶۶ھ) نے ترکستان و خراسان و عراق و حرمین محترمین سے علوم دینی کا اکتساب کیا تھا

ابو حفص عمر شہاب الدین سہروردی المتوفی ٦٣٢ھ سے جو ابو النجیب شہاب الدین سہروردی کے بھتیجے اور مرید تھے تصوف کی دولت حاصل کی اور عراق سے اس کو ملتان میں منتقل کیا مشہور صوفی شاعر عراقی اسی میخانہ کے جرعہ خوار تھے

غزنویوں کا تو حال معلوم نہیں مگر غوریوں کے عہد میں ناصر الدین قباچہ نے جو سلطان التمش کا معاصر اور سندھ کا فرمانروا تھا یہاں پہلی علمی درسگاہ قائم کی جس میں مولٰنا قطب الدین کاشانی نے ماوراء النہر سے آکر درس و تدریس کی مسند بچھائی یہ شیخ الاسلام بہاء الدین کا آغاز عہد تھا وہ بھی یہاں آیا کرتے تھے شیخ فرید الدین گنج شکر (ولادت ٥٨٤ھ وفات ٦٧٩ھ) نے بھی مولٰنا تاج الدین ترمذی سے یہیں فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

خراسان و ایران سے جو علماء اور اہل کمال اس راستہ سے ہندوستان آتے تھے ان کی پہلی منزل یہی شہر ملتان ہوتا تھا اس سبب سے یہاں علماء و فضلاء کا بڑا مجمع رہتا تھا۔

علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں جو علماء امام وقت تھے ان میں چار بزرگ ملتان کے تھے مولٰنا محب ملتانی مولٰنا حمید الدین ملتانی مولانا شہاب الدین ملتانی اور مولٰنا علیم الدین نبیرۂ شیخ الاسلام ملتانی یہ دہلی آکر علوم عقلی و نقلی کے درس دیتے تھے ہندوستان میں معقولات کا درس میں داخل ہونا بھی ملتان ہی کے طفیل سے ملتان کی بربادی کے بعد سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے اول الذکر نے دلی میں اور آخر الذکر نے سنبھل (مرادآباد) میں ہنگامۂ درس گرم کیا،

ملتان کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی شدید مشابہت قندھار سے ظاہر ہوتی ہے وہی خام مکانات وہی ریگستان وہی بارش کی کمی لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان جیسی ایک بارش بھی ملتان میں ہو جائے تو وہاں کے اکثر مکان گر جائیں ملتان کے متعلق ایک مشہور شعر زبان زد ہے۔ ؎

چار چیز است تحفۂ ملتاں گرد و گرما، گدا و گورستاں

جہاں ریت ہو اور بارش کی کمی ہو وہاں کی گرمی کا کیا پوچھنا اور گرد و غبار تو ریگستان کا جوہر ہے گداؤں کا زور پہلے ہوگا مگر اب شاید نہ ہو تاہم ایسے درویش یہاں بہت ہیں جو گو بزرگوں کی گدیوں کے بوریا نشین ہیں مگر ان کی زندگی امیرانہ ہے اور یہ رنگ غالباً حضرت شیخ الاسلام زکریا سہروردی کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا چنانچہ شیخ الاسلام کے پوتے حضرت رکن عالم سلاطین دہلی کے مقرب تھے اور بقول ابن بطوطہ وہ حاکم ملتان کی منظوری کے بغیر کسی کو اپنا مہمان بھی نہیں بناتے تھے اور گورستان کا کیا پوچھنا کہ اس پرانے شہر کا چپہ چپہ اسلامی عظمت کا ایک ایک مدفن ہے۔ ؎

چپہ چپہ پہ ہے یاں گوہر یکتا تہ خاک دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

بڑے بڑے علماء اور بزرگوں کے مقبرے اور مزارات ہیں جن میں سے سوائے اُن کے جن کی نسل میں جاگیریں ہیں باقی بے نشان ہیں مدفن سے مولد یاد آیا کہتے ہیں کہ ملتان کو ایک اور فخر یہ حاصل ہے کہ اس کی سرزمین تین عظیم الشان بادشاہوں کا مولد ہے سلطان محمود تغلق (ناصرالدین محمد شاہ؟) سلطان بہلول لودی اور سلطان احمد شاہ ابدالی ان تینوں بادشاہوں کی جائے پیدائش بھی لوگ

بتاتے ہیں سلطان محمود تغلق لاہوری دروازہ سے کچہری جانے والی سڑک کے ایک محلہ میں جس کو کوٹلہ تولہ خاں کہتے ہیں، پیدا ہوا سلطان بہلول لودھی کی ولادت حسین آگاہی میں ہوئی اور سلطان احمد شاہ ابدالی کا مولد کمشنر صاحب کے بنگلے کے قریب لب سڑک ایک مکان تھا جو اب بے نشان ہے مگر یہ واقعات شاید تاریخ کے رو سے درست نہ ہوں۔

عصر کی نماز کے بعد دوستوں کے ساتھ ملتان کے قابل دید مقامات کی سیر کو نکلا، عربی تاریخوں میں ملتان کے ایک مشہور مندر کا ذکر آتا ہے جس کے اندر سے سندھ کے عرب فاتح محمد بن قاسم ثقفی کو بڑی ضرورت کے وقت بہت سا سونا ہاتھ آیا تھا اس نے اس مندر کو توڑا نہیں بلکہ اصلی حالت پر چھوڑ دیا، اور اس کے قریب ایک جامع مسجد بنوادی اس کے بعد جو عرب ریاستیں یہاں قائم ہوئیں اُنھوں نے بھی اِس کو نہیں چھیڑا بلکہ یہاں کے جاتریوں پر ٹیکس لگا کر خوب آمدنی حاصل کرتی رہیں، کمزور ہو جانے پر جب کبھی کوئی ہندو راجہ اُن پر حملہ کرنا چاہتا وہ یہ کہکر اس کو ڈراتی تھیں کہ اگر تم نے ذرا ہماری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ہم اس مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، اس دھمکی سے وہ ڈر جاتا تھا اور ملتان پر حملہ نہیں کرتا تھا بیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ اس کے بعد جب باطنیوں نے ملتان پر قبضہ کیا تو جلم بن شیبان اسمٰعیلی نے ثقفی کی جامع کو بند کر کے اس مندر کو توڑ کر جامع مسجد کر دیا بعد ازیں جب سلطان محمود نے باطنیوں کو شکست دیکر ملتان کو فتح کیا تو مندر والی مسجد کو ویران کر کے پھر پہلی جامع مسجد کھول دی۔

بیرونی کا چشم دید بیان ہے کہ اس مندر کی عمارت کی جگہ بلندی پر تھی اور اینٹ سے بنی تھی لیکن اس کے زمانہ میں اس کے اکثر حصے میدان ہو چکے تھے سیر کے لئے نکلتے وقت مجھے یہی چیز پہلے یاد آئی، لوگوں نے کہا یہ مندر اب تک باقی ہے اور اب اس کا نام پرہلاد پوری ہے۔

پرہلاد پوری کا مندر۔ یہ مندر موجودہ شہر سے باہر پرانے قلعہ کی جانب شمال ایک بلند مقام پر واقع ہے اسی سے متصل شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کی قدیم خانقاہ ہے موجودہ عمارت اینٹ کی بنی ہوئی ہے، پھاٹک کے بعد ایک وسیع صحن ہے، چاروں طرف سائبان ہے اس میں پرہلاد نرسنگھ بھگت اور لکشمی مہاراج کی مورتیاں ہیں اس مندر کے اندر مسلمانوں کو نہیں جانے دیتے اس لئے اندر کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی

اس مندر کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ اب سے تیس لاکھ برس پہلے یہاں ہرنیہ کشیپو نام ایک راجہ حکمرانی کرتا تھا یہ راجہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا تمام رعایا کو حکم تھا کہ وہ راجہ ہی کی پوجا کرے، جو اس سے سرتابی کرتا اس کی سزا موت تھی اتفاق سے راجہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پرہلاد رکھا گیا جب یہ سن شعور کو پہنچا تو اس نے اپنے باپ کی خدائی سے انکار کیا اس کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں مگر باز نہ آیا آخر تنگ آکر ہرنیہ کشیپو نے ایک آہنی ستون کو آگ سے سُرخ کیا اور پرہلاد کو حکم دیا کہ وہ اس ستون سے چمٹ جائے اس حکم کی تعمیل میں اس نے جب اس ستون سے چمٹنا چاہا تو فوراً ستون بیچ سے پھٹ گیا اور اس میں سے ایک شخص نمودار ہوا جس نے راجہ کو مار ڈالا اسی واقعہ کی یادگار میں ایک مدت کے بعد یہ مندر تعمیر ہوا۔

علامہ بیرونی کا بیان ہے کہ "یہ مندر سورج دیوتا کا تھا اور اسی لئے اس کا نام آدت تھا یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں دو سرخ یاقوت جڑے تھے اور بدن پر سرخ رنگی ہوئی کھال تھی لیکن اب ان چیزوں کا وجود نہیں سنہ ۱۸۴۸ء کی انگریزوں کی لڑائی میں اس مندر کو کافی نقصان پہنچا تھا جس کی مرمت بعد کو ہو گئی اس مندر پر بہت سے اوقاف ہیں، مندر کا انتظام نرسنگھ مندر کمیٹی کرتی ہے۔

خانقاہ و مزار حضرت بہاء الدین زکریا

یہ خانقاہ جو اب مزار کی صورت میں ہے اس مندر سے بالکل ملا ہوا اس کی مغربی سمت میں واقع ہے میرا خیال ہے کہ اگر یہ پرہلاد مندر وہی ادت دیوتا والا پرانا مندر ہے تو عجب نہیں کہ یہ خانقاہ پہلے وہ مقام ہو جس کو مسجد بنا دیا تھا ملتان میں یہ "خانقاہ بہاء الحق" کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں کہ اس خانقاہ کی تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی اور یہاں بیٹھ کر چالیس برس تک ہدایت کا درس دیا تھا خانقاہ کا رقبہ بہت وسیع ہے دو بڑے پھاٹک ہیں ارد گرد عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

پھاٹک کے بعد پہلے ایک صحن ہے صحن کے بعد ایک گلیارا سا ہے جس کو طے کرنے پر اصل مقبرہ آتا ہے جو ایک لمبے کمرہ کی صورت میں ہے اس کے اوپر گنبد ہے مقبرہ کے اندر بیچ میں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی کا پختہ مزار ہے، مزار کے اوپر سیاہ شامیانہ تنا ہے اس مزار کے ہر طرف بہ ترتیب ان کی اولاد و احفاد کی قبریں ہیں باہر خدام اور مجاور بیٹھے زائرین سے نذریں وصول

کر رہے تھے میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا دعائے مسنونہ پڑھی مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا، سہروردی خاندان کا سرتاج یہاں محوِ استراحت ہے میں سبب نہیں جانتا تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر ڈھلک گئے۔

شیخ الاسلام سہروردی کا سالانہ عرس ہوتا ہے بادشاہوں نے یہاں بہت کچھ وقف کیا تھا مگر اب چند دیہات رہ گئے ہیں خان بہادر شیخ مرید حسین قریشی اس کے متولی ہیں اور غالبًا اُنھیں کے خاندان میں تولیت محدود ہے شیخ الاسلام کے مزار کے برابر ان کے بزرگ صاحبزادہ اور جانشین حضرت صدر الدین المتوفی سنہ ۶۶۶ھ کا مزار ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کے عہد میں سلطان غیاث الدین بلبن کا نامور بیٹا محمد سلطان خاں شہید ملتان کا حاکم تھا اور جس نے تاتاری حملہ کے سیلاب کو جس کے تھپیڑوں میں خلافت بغداد کی کشتی ڈوب گئی تھی ملتان میں کامیابی کے ساتھ روک دیا تھا، اور آخر خود اسی واقعہ میں اتفاقًا شہید ہو کر خانِ شہید لقب پایا حضرت امیر خسرو دہلوی بھی اس شہزادہ کے ساتھ اس ہنگامہ میں ملتان میں تھے۔

ملتان سے لکھنؤ

اِستدراک۔ چمن اور کوئٹہ کے بیچ میں جو کوہستانی سلسلہ حائل ہے،

اور جس کو عرض میں قطع کر کے چمن سے کوئٹہ پہنچتے ہیں ہمارے رفیق غلام رسول خاں نے بتایا کہ اس کا نام خوجاک ہے اور جس درہ سے نکل کر یہ انگریزی سڑک نکالی گئی ہے اس کو درۂ خوجاک کہتے ہیں یہ راستہ جس قدر پرپیچ ہے اس کی کیفیت تو بیان کر چکا ہوں خاں صاحب نے جب اس کا نام خوجاک بتایا تو میں نے عرض کی کہ اس سے بہتر تو اس کا نام گنجلک ہے اس کی بلندی تقریبًا سات ہزار فیٹ اور درّہ کی لمبائی تقریبًا بیس میل ہے۔

رکنِ عالم۔ ملتان میں حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی کے مزار پر ہم نے آپ کو چھوڑا تھا، وہاں سے اس کے دوسرے دروازے سے ہم نکلے تو موٹر سٹرک پر ادھر ہی کھڑی ملی سامنے ہی بسمت مغرب حضرت شیخ الاسلام کے پوتے حضرت رکن الدین رکن عالم المتوفی ۷۳۵ھ مزار کا گنبد نظر آیا، لیکن دل میں کشش نہیں ہوئی اس لئے وہاں تک جا نہ سکا۔

سلطان محمد تغلق کے دربار میں حضرت رکن عالم کا بڑا اعزاز تھا ابن بطوطہ ہندوستان انھیں بزرگ کے عہد میں آیا ہے حضرت برہان الدین اسکندری نے ابن بطوطہ کو اسکندریہ کے قیام کے زمانہ میں جن تین مشہور بزرگوں کی زیارت کی خوشخبری سنائی تھی اُن میں سے ایک یہ بھی تھے، ابن بطوطہ ملتان میں انھیں کی خانقاہ میں جو شہر سے باہر تھی حاکم وقت کی اجازت سے ٹھہرا تھا۔

حضرت رکن عالم کا یہ روضہ سلطان محمد تغلق نے بنوایا تھا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اس میں نقاشی کا کام نہایت عمدہ ہے اس مزار پر چند دیہات وقف ہیں اور اُس کے متولی بھی شیخ مرید حسین صاحب ہیں۔

مزار شمس تبریز۔ شمس تبریز کے نام سے تو حضرت مولانا جلال الدین رومی کے مرشد مشہور ہیں جن کی طرف دیوان شمس تبریز منسوب ہے ملتان میں ایک مزار اسی نام سے مشہور ہے اہل تاریخ کے نزدیک اتنا تو مسلم ہے کہ یہ وہ شمس تبریز نہیں جو مولانا رومی کے پیر تھے مگر پھر یہ کون تھے اس کے جواب میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ اسماعیلی مذہب کے کوئی داعی تھے ایک مختصر صحن اور برآمدہ کے بعد ایک کوٹھری میں ان کا مزار ہے، مزار پر گنبد بنا ہے، دیواروں پر چینی کا کام ہے جس وقت میں وہاں پہنچا کچھ لوگوں کو باہر قرآن پڑھتے دیکھا، دل نے کشش نہ پائی جلد واپس آگیا۔

ان کی نسبت مقامی اطلاع یہ ہے کہ ان کا نام شمس الدین تھا سنہ ۱۱۴۳ء (سنہ ۵۳۰ھ) میں بمقام سبزوار پیدا ہوئے اپنے مرشد کے حکم سے ملتان تشریف لائے مشہور ہے کہ یہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے ہمعصر تھے حضرت کے اشارہ پر اہل ملتان نے ان سے مقاطعہ کر لیا تھا یہاں تک کہ کسی نے ان کو پکانے کے لئے آگ بھی نہیں دی اُنھوں نے ناچار اپنی یہ کرامت دکھائی کہ دریا سے مچھلی اُٹھا کر آفتاب کے سامنے کیا

اور کہا کہ اے آفتاب تو میرا ہمنام (شمس) ہے قریب آ جا کہ مچھلی بھون لوں، آفتاب قریب آ گیا اور مچھلی بھن گئی، کہتے ہیں کہ ملتان میں گرمی اسی وقت سے زیادہ ہو گئی ہے سنہ ۱۲۷۶ء (سنہ ۶۷۵ھ) ان کی تاریخ وفات بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ سنہ ۱۲۳۰ء میں ان کے پوتے نے یہ عمارت تیار کرائی ہے، اس کے متولی شیعہ ہوتے ہیں موجودہ متولی و سجادہ نشین سید ضمیر حسن شاہ صاحب ہیں

عیدگاہ :- اس وقت ملتان کی سب سے یادگار عمارت عیدگاہ کی مسجد ہے یہ شہر سے شمال و مشرق سمت میں ایک میل کی مسافت پر واقع ہے۔ دروازہ بجائے پورب رخ کے ایک بازو پر ہے، اس سے داخلہ کے وقت مسجد کی پوری شان ظاہر نہیں ہوتی دروازہ سے داخل ہوتے ہی بائیں بازو پر مسجد کی عمارت ملے گی صحن بہت وسیع ہے اندازہ ہے کہ اس میں ایک ہزار آدمی آ سکتے ہوں گے مسجد کا دالان خاصہ لمبا ہے اوپر گنبد اور مینار ہیں دیواروں پر کاشی کا نہایت عمدہ کام ہے پروفیسر اکبر صاحب منیر نے جو ایران و عراق کی سیاحت کر چکے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ تھے کہا کہ یہ کام ایران کے سوا اور کہیں میں نے نہیں دیکھا اس مسجد کو نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور و ناظم ملتان نے بنوایا تھا سنہ ۱۷۲۵ء میں یہ تکمیل کو پہنچی تھی

نواب عبدالصمد خاں کا خطاب سیف الدولہ دلیر جنگ تھا، اور اسی لقب سے مآثر الامرا میں ان کا تذکرہ ہے سلطان محمد فرخ سیر کے عہد میں پنجاب میں صوبہ دار مقرر ہوئے اس زمانہ میں یہاں سکھوں کی بڑی شورش تھی عبدالصمد خاں نے اپنے زمانہ میں ان کے اصل مرکز کا کامیاب محاصرہ کیا اور ان کے سرداروں کو قید کر کے دلی بھیجا بعد میں یہ ملتان کے ناظم مقرر ہوئے اور سنہ ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی

۱۸۱۶ء میں سکھوں نے ملتان کو فتح کیا کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں یہ جامع مسجد اصطبل کے کام میں لائی جاتی رہی ۱۸۴۸ء میں مسٹر اگنیو اور انڈرسن جو ریاست لاہور کے انگریز ریزیڈنٹ کے نمایندے ہو کر دیوان مولراج کو ملتان کی نظامت سے معزول کرنے آئے تھے یہیں فروکش ہوئے تھے اور یہیں مولراج کے سکھ افسروں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے تھے عمارت کے بائیں طرف کے آخری منارہ پر انگریزی زبان میں حسب ذیل کتبہ ہے۔

> "یہاں ۲۹ر اپریل ۱۸۴۸ء کو پیٹرک وان اگینو بنگال سول سروس اور لفٹنٹ ولیم انڈرسن سکینڈ کمپنی فیوز لیئرز جو لاہور کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ تھے نہایت بیرحمی سے قتل کئے گئے۔"

اس واقعہ کے بعد لڑائی پیش آئی جنگ کے بعد جب امن ہوا تو انگریزوں نے یہاں ڈپٹی کمشنر کی کچہری قائم کی ۱۸۶۳ء میں مسلمانوں کی درخواست پر اُن کو واپس ملی اس وقت یہ نہایت خستہ حالت میں تھی مسلمانوں نے عام چندہ سے اس کی مرمت کرائی اس وقت یہ مقامی انجمن اسلامیہ کے زیر نظم ہے زمین کے چند بگھے اس پر وقف ہیں جن کی اسی قدر آمدنی ہے کہ اس سے چوکیدار کی تنخواہ نکل آتی ہے ضرورت ہے کہ اہل شہر اپنی اس تاریخی مسجد کی بقا و ترقی کی طرف توجہ فرمائیں۔

مسجد علی محمد خاں۔ دلی کی مرکزی حکومت میں جب ضعف ہوا تو پنجاب اور سندھ کے قطعہ قطعہ میں افغان سرداروں اور سکھ مثل[1] داروں (جتھہ داروں نے)

---

[1] سکھوں نے اپنے جتھہ داروں کے لئے یہ اصطلاح قائم کی تھی۔ "س"

اپنی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں، راجہ رنجیت سنگھ نے جو خود ایک مثل دار (جتھہ دار) کا بیٹا تھا رفتہ رفتہ ان تمام سکھ جتھوں کو توڑ کر ایک مرکزی سکھ ریاست قائم کر لی اس مرکزیت سے طاقتور ہو کر اس نے ایک ایک اسلامی ریاست کو فتح کرنا شروع کیا اس زمانہ کی یادگار صرف بھاولپور کی اسلامی ریاست رہ گئی ہے اس زمانہ میں ملتان میں بھی ایک اسلامی ریاست قائم تھی جس کا بانی درانی سلسلہ کا صدوزئی افغان تھا نواب علی محمد خاں شجاع خاں اور مظفر خاں بہادر صفدر جنگ اس خاندان کے مشہور افراد ہیں رنجیت سنگھ نے اسی خاندان سے اس ملک کو فتح کر کے دیوان مول راج کے باپ کے حوالہ کیا دیوان مول راج سے ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے چھینا۔

اس صدوزئی افغانی ریاست کی یادگار یہ مسجد ہے ۱۱۷۱ھ میں بنائی گئی تھی، سکھوں کے زمانہ میں یہاں سکھ ناظم ملتان کی کچہری ہوتی تھی، اور اس کے اندر سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کو رکھا گیا تھا انگریزوں کے قبضہ کے بعد یہ مسلمانوں کو واپس دی گئی مسجد کے متعلق چند دکانیں ہیں جن کی آمدنی سے مسجد کا خرچ پورا ہوتا ہے۔

باغ عام و خاص۔ دہلی دروازہ کے باہر خانقاہ شمس تبریز کے جنوب میں واقع ہے کہتے ہیں کہ یہاں شاہزادہ مراد بن شاہ جہاں بادشاہ عام لوگوں کی عرضیاں سننے کے لئے اجلاس کرتا تھا اور اس کا دربار خاص بھی یہیں لگتا تھا اس لئے باغ عام و خاص کے نام سے مشہور ہوا سکھوں کے عہد میں مولراج کا

باپ سانول مل جو رنجیت سنگھ کی طرف سے یہاں کا دیوان و صوبہ دار مقرر ہوا تھا اس میں اجلاس کرتا تھا۔

یہاں اس شاہی باغ کے علاوہ ایک حضوری باغ ہے جس میں ایک عمارت اب تک قائم ہے اس کو بھی شہزادہ مراد نے بنوایا تھا۔

پرانا قلعہ ۔ یہ قلعہ ایک بلند اور وسیع ٹیلہ پر واقع ہے، جب یہ آباد تھا تو اس کا رقبہ سوا میل کا تھا اس کے ایک طرف دریائے راوی بہتا تھا قلعہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے نشان اب تک باقی ہیں چونکہ یہ جگہ بہت بلند ہے شام کے وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے یہاں بہت آتے ہیں اس لئے اہل شہر یہاں ہر شام ہوا خوری کے لئے بکثرت آتے رہتے ہیں یہاں سے کھڑے ہو کر دیکھئے تو سارا شہر نظر کے سامنے ہوگا۔

اس وقت یہ قلعہ تودۂ خاک ہے، صرف ایک وسیع ہال اپنی حالت پر آج تک کھڑا ہے، یونیورسٹی نے اپنے سالانہ امتحان کے لئے اسی بدحال ہال کو پسند کیا ہے اس میں یونیورسٹی کی طرف سے لڑکوں کا سالانہ امتحان ہوتا ہے۔

قلعہ کے بیچ میں مسٹر اگنیو اور انڈرسن صاحبان کے دردناک قتل کی یادگار میں پچاس فیٹ لمبا مینار کھڑا کیا گیا ہے۔

جامع مسجد ۔ یہاں جامع مسجد بھی ہے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا مولانا اشفاق علی صاحب فاضلِ دیوبند جو اس کے خطیب و امام ہیں میرے ساتھ

تھے، مغرب کا وقت قریب تھا درگاہ شیخ اسلام بہاء الحق سے واپس ہوتے ہوئے موصوف یہاں اتر گئے یہ جامع مسجد ایک انتظامی مجلس کے زیر نگرانی ہے اور جناب سید میر حسن صاحب اس کے متولی ہیں۔

ملتان چھاؤنی۔ ملتان دو حصوں میں منقسم ہے ایک پرانا شہر ملتان ہے اور دوسرا نیا ہے جس کو ملتان صدر یا ملتان چھاونی کہتے ہیں جو انگریزی فوجی کیمپ یا کینٹونمنٹ ہے، یہاں کی آبادی اچھی خاصی ہے بنگلے اور کوٹھیاں بکثرت ہیں، مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے یہاں کے قومی رہبر و کارکن سید میر حسن صاحب ہیں جو گو آنکھوں سے معذور اور ضعیف ہو چکے ہیں تاہم یہاں کے معتمد علیہ وہی ہیں، ان کے صاحبزادے سید عبد الغنی صاحب بی اے یہاں گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں، اور قومی کاموں میں اپنے والد ماجد ہی کی طرح سرگرم ہیں۔

سید میر حسن صاحب اور دوسرے مسلمانوں کی کوشش سے سنہ ۱۹۱۱ء میں یہاں محمڈن ہال کے نام سے ایک عمارت تیار ہوئی اور ایک انجمن نصرۃ الاسلام قائم ہوئی اس کے ماتحت ایک اسکول اور ایک لائبریری کا افتتاح ہوا، جس کا نام محمڈن لائبریری ہے، میرا رسم تعارف اس اسکول اور اس لائبریری اور اسی کے ساتھ اس لائبریری کے روح روال سید میر حسن صاحب سے اسی زمانہ سے ہے، یہ انجمن جب قائم ہوئی تو میں نے سید صاحب کی طلب پر اپنے حقیقی برادر زادہ مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی کو جو اسی زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے تھے یہاں بھیجا تھا اور

انھیں کی کوشش اور مشورہ سے اس لائبریری نے جنم لیا تھا، اس کے بعد مولوی عبید الباری صاحب ندوہ چھوڑ کر لکھنؤ سے سند فضیلت کے بجائے ہیوٹ انجینرنگ اسکول کی سند لے کر یہاں وارد ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں اس لائبریری کے سکرٹری منتخب ہوئے اس وقت سے آج تک وہ اسی حیثیت سے اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

محمڈن لائبریری۔ لائبریری کی عمارت اچھی اور بڑی ہے، احاطہ بھی وسیع ہے اور سبزوں اور پھولوں سے بارونق ہے ۱۹۱۵ء میں عاریت کی چند کتابوں کے سوا اس میں کچھ نہ تھا، سکرٹری صاحب کی کوشش سے اس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ اب اس میں پانچ ہزار کتابوں کے قریب ہے، اردو کی تمام اچھی کتابیں اور اردو کے مشہور مصنفین کی تمام تصنیفات یہاں موجود ہیں فارسی اور عربی کی بھی کچھ کتابیں ہیں کسی قدر انگریزی کا بھی سرمایہ ہے کتابوں کی فن وار تعداد حسب ذیل ہے۔

مذہب و دینیات،	تاریخ و سوانح،	ناول اور افسانے،	جغرافیہ اور سفرنامے
۴۵۰	۵۰۰	۲۱۱۰	۴۰

علمی و ادبی،	متفرقات،	کتب فارسی و عربی،	کتب انگریزی۔
۴۷۰	۷۰	۳۵۰	۴۳۰

قابل ذکر نئے اور پرانے علمی رسائل کی جلدیں بھی موجود ہیں اور وہ اس شمار میں شامل نہیں، روزانہ اخبارات اور ماہوار علمی رسالے بھی آتے ہیں

یہ کتابیں وہاں الماریوں میں قرینہ سے سجائی گئی ہیں۔

ملتانی زبان۔ ملتان کی ایک خاص زبان بھی ہے جو پنجابی اور سندھی سے الگ ہے، ملتان کا علاقہ پنجاب اور سندھ کے بیچ میں واقع ہے اس لئے اس زبان کو ان دونوں کے بیچ کی کڑی سمجھ لیجئے۔

روانگی۔ ملتان میں میرا قیام تین روز رہا جن میں سے ایک آدھ دن علالت میں بھی گزرا، چوتھے روز روانگی کا سامان ہوا، ۱۱ بجے کے قریب ٹرین جاتی ہے، اسی پر سوار ہوا، احباب اسٹیشن تک پہنچانے آئے، گاڑی چلی تو پھر وہی ریگستان کا منظر تھا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے پنجاب کا سرسبز علاقہ آنے لگا، مغرب کے بعد لاہور آیا، پہلے خیال تھا کہ ایک دو دن لاہور بھی ٹھہروں مگر ملتان میں زیادہ ٹھہر جانے کے سبب سے یہاں کے قیام کو ملتوی کیا۔

لکھنؤ۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر بات پیش نہیں آئی لکھنؤ میں برادر عزیز و محب صمیم مولانا مسعود علی صاحب ندوی دارالعلوم میں تعمیر مسجد کے سلسلہ میں مقیم تھے ان کو تار کے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی دوسرے دن دوپہر کے قریب گاڑی لکھنؤ پہنچی، اسٹیشن پر مولانا مسعود علی صاحب اور ندوہ کے احباب و اعزہ موجود تھے اتر کر دارالعلوم ندوہ کے اس خسخانہ میں آیا، جو وہاں کی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مسجد کے سامنے نہایت سلیقے سے تیار ہوا تھا اور جس کو مولانا نے اپنی صفائی اور خوش سلیقگی سے ایسا بنا دیا تھا کہ کوٹھیوں اور بنگلوں والے آ آ کر اس پر رشک کرتے تھے

مسجد کی تعمیر جاری تھی، مزدوروں اور معماروں کا ہنگامہ برپا تھا ایک طرف آہنی جنگلوں کے لئے لوہاروں کا کام جاری تھا دوسری طرف ربڑ کی لمبی نلکیوں کے ذریعے ہر طرف مصنوعی نہر جاری تھی ندوہ کے اعزازی کارکن تعمیر کے امور متعلقہ کی انجام دہی کی غرض سے مولانا کے گرد و پیش حلقہ زن تھے دار العلوم کے طلبہ افغانستان کے حالات اور اپنے افغان بھائیوں کی ترقیوں کی روئداد سننے کو آتے رہے، قندھار کے انار اور انگور جو ساتھ آئے تھے وہ ان عزیزوں کو تحفے کے طور پر ملے یوں ہی دن گزر گیا، اور رات آئی، ۷ر نومبر کی صبح تھی افغانستان کے سفر کی مستی کا خمار ہنوز چھایا ہوا تھا۔

نادر شاہ کی شہادت

کہ یکبیک صبح کو ایک دوست نے آکر اطلاع دی کہ شاہ افغان نادر خاں نے شہادت پائی یہ ایسی خبر تھی کہ جس کے ماننے کو دل تیار نہ ہوا، ندوہ کے بعض عزیزوں کو سائیکل پر اخبارات کے دفتر میں بھیجا، دس بجے کے قریب خبر یقین کے درجے کو پہنچ گئی، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے پچھلے چند ہفتے ایسے تماشے کی سیر میں گزارے جس کا خاتمہ ٹریجڈی پر ہوا۔

مسافر از ڈاکٹر اقبال

کیا عجیب اتفاق ہے، آج ۷ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو جب اس داستان سفر کی آخری سطر سے میں نے فراغت پائی ہے ڈاک کے قاصد نے

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نئی تالیف "مسافر" ہاتھ میں دی یہ افغانستان کی چندروزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے جو ابھی شائع ہوا ہے، فارسی زبان میں خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں، اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی، اور احمد شاہ درّانی کی خاموش تربتوں کی زبانِ حال سے سوال و جواب ہیں، مسافر کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خاں سے اظہار توقعات پر ہے، کہتا ہے:

خطاب بہ شاہ ظاہر خاں

اے قبائے پادشاہی بر تو راست
سایۂ تو خاکِ ما را کیمیا است
از تو اے سرمایۂ فتح و ظفر
تختِ احمد شاہ را شانے دگر
حرفِ شوق آوردہ ام از من پذیر
از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر
ہر کہ خود را صاحبِ امروز کرد
گرد او گردد سپہر گرد گرد

دو جہانِ رنگ و بو را آبروست
دوش ازو امروز ازو فردا ازوست
مردِ حق سرمایۂ روز و شب است
زانکہ او تقدیرِ خود را کوکب است
سرگذشتِ آلِ عثماں را نگر
از فریبِ غربیاں خونیں جگر
ذکر و فکرِ نادری در خونِ تست
قاہری با دلبری در خونِ تست
اے فروغِ دیدۂ برنا و پیر
سِرِّ کار از ہاشم و محمود گیر
ہم ازاں مردے کہ اندر کوه و دشت
حق ز تیغِ او بلند آوازه گشت
روزہا شب ہا تپیدن می تواں
عصرِ دیگر آفریدن می تواں
صد جہانِ باقیست در قرآں ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز
باز افغاں را ازو سوزے بدہ
عصرِ او را صبحِ نوروزے بدہ

(مسافر)